زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ ۱۵۰/روپے۔ فی شمارہ ۱۵/روپے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۳۰۰/روپے

پاکستان میں سالانہ ۲۵۰/روپے رجسٹرڈ ڈاک ۴۰۰/روپے

دیگر ممالک میں سالانہ ۵۰۰/روپے رجسٹرڈ ڈاک ۷۰۰/روپے

ہندوستان میں ۸ سال کی خریداری صرف ۱۰۰۰/روپے میں دستیاب ہے

نوٹ: (اوپر کی رقوم ہندوستانی روپے میں دی گئی ہیں)

- سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

- خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
- معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
- کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

مقالہ نگار حضرات سے التماس

- مقالہ صفحہ کے ایک طرف لکھا جائے۔
- حواشی مقالے کے آخر میں دیئے جائیں۔
- ماخذ کے حوالہ جات مکمل اور اس ترتیب سے ہوں: مصنف یا مؤلف کا نام، کتاب کا نام، مقام اشاعت، سن اشاعت، جلد یا جز اور صفحہ نمبر۔

عبد المنان ہلالی جوائنٹ سکریٹری نے معارف پریس میں چھپوا کر دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ سے شائع کیا۔

دار المصنفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۱۸۲ ماہ شوال المکرم ۱۴۲۹ھ مطابق ماہ اکتوبر ۲۰۰۸ء عدد ۴

دار المصنفین شبلی اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

فہرست مضامین

شذرات

مسلمان نوجوانوں کے خلاف ملک کے طول وعرض میں بلا جواز اور منصوبہ بند مہم گذشتہ کئی برسوں سے جاری ہے۔ جہاں کہیں بھی تشدد کا کوئی واقعہ رونما ہوتا ہے تحقیق و تفتیش کے کسی ادنیٰ تکلف کے بغیر اسے مسلمانوں کی کسی فرضی یا واقعی جماعت سے منسوب کردیا جاتا ہے اور گرفتاری، ایذا رسانی اور تعذیب کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔ اس کا نشانہ بالعموم اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اچھی ملازمتوں میں برسرکار نوجوان ہوتے ہیں۔ واقعہ کے چند گھنٹہ کے اندر اس سے متعلق اتنی تفصیلی معلومات فراہم کردی جاتی ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پولس کے پاس اس سلسلہ میں مکمل معلومات پہلے سے موجود تھیں اور انتظار صرف واقعہ کے ظہور پذیر ہونے کا تھا۔ اگر پولس کو سب کچھ معلوم رہتا ہے تو وہ ان حادثات کو روک کیوں نہیں پاتی۔ اور اگر اس کے پاس اتنے پختہ ثبوت موجود ہوتے ہیں تو عدالت میں اپنا موقف ثابت کرنے میں ناکام کیوں رہتی ہے۔ اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ میڈیا اور عام لوگ جو دوسرے معاملات میں پولس کے بیانات کو بالعموم نہایت شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اس فرضی داستان کے ایک ایک حرف پر ایمان لاتے ہیں اور اس سے معمولی اختلاف بھی حب الوطنی کے خلاف تصور کرتے ہیں۔

۱۹ ستمبر کو بٹلہ ہاؤس میں جو کچھ ہوا اور اس کے نتیجہ میں اعظم گڑھ جس طرح پورے ملک کی منفی توجہ کا مرکز بنا اور وہاں کے مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کردیا گیا وہ اس سلسلہ کی ایک کڑی ہی نہیں بلکہ اس کا نقطہ عروج ہے۔ فرقہ پرست طاقتوں کی نگاہیں ایک عرصہ سے اعظم گڑھ پر مرکوز تھیں۔ برسوں سے میڈیا کے ذریعہ اس کی ایک خاص قسم کی شبیہ بنائی جارہی تھی۔ یوپی کو گجرات بنانے کے منصوبہ میں اعظم گڑھ سے شروعات کی بات بھی فضا میں گونجتی رہی ہے۔ چنانچہ اعظم گڑھ کے مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ ہورہا ہے وہ کسی وقتی ابال کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ ایک سوچی سمجھی منصوبہ بندی کا حصہ ہے۔ آتنگ گڑھ اور نرسری آف ٹیررزم جیسے گھناؤنے الفاظ سے اس کا چہرہ مسخ کیا جارہا ہے۔ اس ضمن میں ملک کے لیے اس خطہ کی خدمات کی طویل اور روشن تاریخ کو یکسر فراموش کردیا گیا۔ ۱۸۵۷ء سے برٹش سامراج کے ملک سے رخصت ہوجانے تک جنگ آزادی میں اعظم گڑھ کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ یہ جنگ اس دیار کے مسلمانوں اور ہندوؤں نے مل کر لڑی تھی۔ مولانا شبلی کی اصل جولانگاہ، علم و تحقیق کا میدان تھا، اس کے باوجود ملکی سیاست اور جنگ آزادی میں انہوں نے گراں قدر خدمات انجام دیں۔ انہوں نے نظریاتی سطح پر اور ان کے تلامذہ اور دارالمصنفین نے عملی طور پر اس میں بڑا نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ دارالمصنفین نے ابتداء ہی سے اس دیار میں تحریک آزادی کے مرکز کی حیثیت اختیار کرلی تھی۔ تحریک آزادی کے تمام سرکردہ لیڈر مشرقی یوپی کے دورے کے موقع پر یہاں

ضرور آتے اور اس کے مہمان خانہ میں قیام کرتے۔ گاندھی جی بھی یہاں آچکے ہیں۔ پنڈت موتی لال نہرو اور پنڈت جواہر لال نہرو کو اس سے خاص انسیت تھی دونوں ہی اس کے لائف ممبر تھے اور ہمیشہ یہیں قیام کرتے تھے۔ اس علاقہ میں نان کوآپریشن کی غیر معمولی کامیابی میں دارالمصنفین کا بڑا حصہ تھا۔ دارالمصنفین نے اسلامیات اور اسلامی تاریخ کے علاوہ ہندوستان کے عہد وسطی کی تاریخ پر بڑا گراں قدر لٹریچر فراہم کیا ہے۔ اہل نظر جانتے ہیں کہ یہ لٹریچر مسلم دور حکومت کی مشترکہ میراث پر زور دیتا ہے جس سے دونوں قوموں کے درمیان مفاہمت اور یگانگت کے جذبات فروغ پائیں۔ مدرسۃ الاصلاح نے آزادی اور تقسیم ملک سے پہلے کے ہیجان انگیز دور میں جس پامردی سے تحریک آزادی کا ساتھ دیا وہ تاریخ کا حصہ ہے۔ یہ شبلی کی وراثت تھی جسے ان کے تلامذہ اور متوسلین نے حرز جان بنائے رکھا۔

اعظم گڑھ ایک گنجان آبادی والا علاقہ ہے۔ مقامی طور پر دستیاب وسائل سے اتنی بڑی آبادی کی کفالت ممکن نہیں۔ یہاں نہ پہلے کوئی انڈسٹری تھی اور نہ اب ہے۔ پورے ضلع میں اعلیٰ تکنیکی تعلیم کا کوئی ادارہ نہیں۔ ان سب کے باوجود یہاں کے مسلمانوں نے اعلیٰ تعلیم کے حصول میں غیر معمولی حوصلہ اور دلچسپی کا مظاہرہ کیا ہے۔ اپنے قوت بازو سے حاصل کی ہوئی خوش حالی سے بھی کسی حد تک آشنا ہیں۔ اپنے مذہبی تشخص کا بھی احساس ہے۔ اس احساس اور کسی قدر خوش حالی کے باعث یہاں صاف ستھرے مدارس بھی قائم ہیں اور کشادہ اور پررونق مساجد بھی۔ اپنے تہذیبی ورثہ سے بھی یکسر ناآشنا نہیں ہیں۔ کچھ لوگوں کو یہ سب اچھا نہیں لگتا۔ یہاں کے مسلمانوں کی خوش حالی اور اعلیٰ تعلیم کے حصول میں اتنی دلچسپی انہیں پسند نہیں۔ وہ اس صورت حال کو بدل دینا چاہتے ہیں۔ وہ یہاں کے لوگوں کے دلوں میں عدم تحفظ کا ایسا احساس پیدا کرنا چاہتے ہیں کہ وہ اپنے بچوں کو حصول تعلیم کے لیے علاقہ سے باہر بھیجنا بند کردیں۔ وہ اس راز سے واقف ہیں کہ اگر حصول علم سے ان کی توجہ ہٹادی جائے تو باقی کام بہت آسان ہوجائے گا۔ لیکن یہ یقین ہے کہ اعظم گڑھ کے حوصلہ مند لوگ فرقہ پرستوں کے ان ناپاک عزائم کو پورا نہیں ہونے دیں گے اور ایک نئے عزم کے ساتھ حصول علم کی منزل مراد کی طرف اپنا سفر جاری رکھیں گے۔

یہ یاد دلانے کی چنداں ضرورت نہیں کہ علمی اور معاشی میدان میں اعظم گڑھ کے مسلمانوں نے جو بھی کامیابی حاصل کی ہے وہ کئی نسلوں کی کوشش اور محنت کا ثمرہ ہے۔ یہ علاقہ شیراز ہند کی جغرافیائی حدود میں شامل تھا چنانچہ علم کی روایت یہاں کے لیے نئی نہیں۔ جدید تعلیم کے حصول کے لیے سرسید کی آواز پر لبیک کہنے والوں میں یہاں کے لوگ پیش پیش تھے۔ چنانچہ ۱۸۷۵ء میں مدرسۃ العلوم میں پہلے پہل داخلہ لینے والے چار طالب علموں میں سے دو کا تعلق اعظم گڑھ سے تھا۔ پھر شبلی اور ان تلامذہ نے یہاں علم و دانش کے چراغ روشن کیے۔ نیشنل اسکول بنایا جو اب ایک خوبصورت اور عظیم الشان پوسٹ گریجویٹ کالج کا قالب اختیار کرچکا

ہے۔ مدرسۃ الاصلاح قائم کیا جس کا فیض ایک صدی سے جاری ہے۔ چراغ سے چراغ جلا۔ مدارس اور مکاتب کا ایک سلسلہ قائم ہوگیا۔ چاروں طرف علم کی روشنی پھیلتی چلی گئی۔ لیکن یہ سب چند دنوں میں حاصل نہیں ہوگیا۔ اس کے لیے یہاں کے مسلمانوں نے بڑی قربانی دی ہے۔ نسلیں گذر گئیں جب یہاں کے لوگوں نے ایک بہتر مستقبل کی تلاش میں دور دراز کے ممالک کا قصد کرنا شروع کیا۔ انڈونیشیا، برما، ملیشیا اور مشرق وسطی کے ممالک کی خاک نوردی کی۔ محنت مزدوری کی، دشت و بیابان میں خون پسینہ ایک کیا، انڈسٹری میں ملازمت کی، اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تدریسی ذمہ داریاں سنبھالیں، کاروباری اور تجارتی ادارے قائم کیے، کتنی ہی جوانیوں اور بڑھاپوں کی بھینٹ چڑھائی، تب کہیں نسلوں کی کوہ کنی کے بعد خوش حالی کی جوئے شیر کی ایک ہلکی سی دھار یہاں تک لانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ ایک آزاد ملک کے آزاد شہری کی حیثیت سے انہیں اپنی محنت کے اس ثمر سے مستفید ہونے کا حق یقیناً حاصل ہونا چاہیے۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ ان وسائل کو مثبت اور تعمیری کاموں میں استعمال کیا جائے۔ موجودہ صورت حال میں اس خطہ میں اعلیٰ تعلیمی اور فنی اداروں کا قیام ایک بنیادی ضرورت کی صورت اختیار کر چکا ہے۔

موجودہ صورت حال سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ضروری ہے کہ ایک موثر حکمت عملی وضع کی جائے۔ یہ ایک طویل اور صبر آزما جنگ ہے جسے اس کے منطقی نتیجہ تک پہونچانے کے لیے بڑے تحمل، بیدار مغزی اور سیاسی بصیرت سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ یہ ایک ملی مسئلہ ہے اور اسے اسی سطح پر حل کیا جانا ہے۔ شدت پسندی سے نمٹنے کے نام پر بے شمار معصوم نوجوانوں کی زندگیاں برباد اور ان گنت خانوادے تباہ ہو چکے ہیں۔ اس سلسلہ میں ماخوذ نوجوانوں کی بے گناہی عدالتوں میں چلنے والے مقدمات سے فراہم ہوتی چلی جارہی ہے۔ اب یہ سلسلہ رکنا چاہیے اس باب میں مزید تاخیر کے اثرات تباہ کن اور دوررس ہوں گے۔ اس سلسلہ میں بعض امور فوری توجہ کے مستحق ہیں اور بعض کے لیے طویل مدتی منصوبہ بندی کی ضرورت ہے۔ پورے معاملہ کے خلاف عدالتی چارہ جوئی کا مسئلہ فوری توجہ کا مستحق ہے۔ اس سلسلہ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی طرف سے اپنے ماخوذ طلبہ کے مقدمات کی پیروی کا فیصلہ بڑی اہمیت کا حامل ہے، وائس چانسلر پروفیسر مشیر الحسن کو ان کے اس جراتمندانہ اقدام کے لیے یاد رکھا جائے گا۔ اس واضح سچائی کی تائید میں بہت سے ممتاز قانونی ماہرین، صحافی، سیاسی قائدین اور حساس اور باشعور افراد کھل کر سامنے آرہے ہیں۔ یہ لوگ ہندوستانی معاشرہ کا ضمیر اور ہندوستانی جمہوریت کی آبرو ہیں۔ ان سب کے تعاون سے بہتر نتائج کے امکانات بڑھ گئے ہیں۔ خود اعظم گڑھ کے مسلمانوں نے بالعموم اور سنجر پور کے باشندوں نے جو براہ راست اس طوفان کی زد میں ہیں، بالخصوص جس بے مثال عزیمت، ہمت، حوصلہ اور تحمل کا مظاہرہ کیا ہے وہ لائق تعریف بھی ہے اور باعث

فخر بھی۔ انشاء اللہ اس کے نہایت دوررس نتائج برآمد ہوں گے۔

اس سلسلہ میں دوسرا فوری توجہ کا مسئلہ یہ ہے کہ نہ صرف اس واقعہ کی بلکہ گذشتہ چند سالوں میں ہونے والے اس طرح کے تمام واقعات کی سپریم کورٹ کے کسی برسرکار جج بلکہ ججوں کے ایک پینل سے تحقیقات کرائی جائے۔ اس سے نہ صرف یہ کہ انصاف کے تقاضے پورے ہوں گے بلکہ اس سے پوری فضا صاف ہونے میں مدد ملے گی۔ یہ بات ملک کے وسیع تر مفاد میں ہے کہ ان گھناونے جرائم میں ملوث مجرموں کو بے نقاب کیا جائے اور انہیں قرار واقعی سزا دی جائے۔ اس کے بغیر معصوم زندگیاں تباہ ہوتی رہیں گی اور مجرموں کو اپنے منصوبوں کو انجام دینے کی کھلی چھوٹ حاصل رہے گی۔ ان مقاصد کے حصول کے لیے سماج کے مختلف طبقوں سے تعلق رکھنے والے انصاف پسند شہریوں کا زیادہ سے زیادہ تعاون حاصل کیا جائے۔ ملک کے باشندوں کی غالب اکثریت انصاف پسند، صلح جو، سیکولر اور تکثیری معاشرہ میں یقین رکھتی ہے۔ اسی طرح میڈیا کے منفی رویہ کے باوجود صحافیوں سے گفت و شنید اور تعاون کا سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔ عصر حاضر میں ذرائع ابلاغ کو جو غیر معمولی اہمیت اور سماج میں اسے جو نفوذ حاصل ہو چکا ہے اس کے پیش نظر یہ ضروری ہے۔ آج نہیں تو کل ان میں سے کچھ لوگ ضرور حق و صداقت کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے آمادہ ہو جائیں گے۔

طویل مدتی کاموں میں سب سے اہم کام سیاسی سطح سے متعلق ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس مسئلہ کی جڑیں سیاست میں پیوست ہیں اور اس کا مستقل اور پائدار حل سیاست ہی کے ذریعہ ممکن ہے۔ ملک کے دستور نے اقلیتوں کو جو حقوق تفویض کیے ہیں ان میں سے بہت سے حقوق آزادی کے چھ دہوں کے بعد بھی ان کی دسترس سے باہر ہیں۔ البتہ ووٹ کا حق ان کو حاصل ہے۔ اس کے دانشمندانہ استعمال سے بہت سے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک مشترکہ پلیٹ فارم کی ضرورت ہے۔ اب صرف ان پارٹیوں سے تعاون کیا جائے جو ملک میں پھیلی ہوئی اس مسموم فضا کو بدلنے کے عزم کا اظہار کریں اور اس کا عملی ثبوت بھی فراہم کریں۔ اور اسے اپنے انتخابی منشور میں نمایاں طور پر جگہ دیں۔ ہمیں جتنی ان کی ضرورت ہے اس سے زیادہ ان کو ہماری ضرورت ہے۔ اور شاید اب وقت آگیا ہے کہ مسلمان میدان سیاست میں دوسروں کا سہارا ڈھونڈنے کے بجائے اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا شروع کریں۔ ملک کے سیاسی عمل میں بھرپور اور منصوبہ بند حصہ داری کے ذریعہ ہی ان پیچیدہ مسائل کو حل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کے لیے ہماری صفوں میں مکمل اتحاد اور ایک قابل اعتماد مرکزی قیادت کی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر ملکی سیاست میں کسی اہم تبدیلی کی توقع عبث ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہندوستان کے مسلمان اس چیلنج کا موثر جواب دینے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں اور اس کے لیے تیار بھی ہیں۔

مقالات

ماحولیاتی بحران، اسباب وعلاج

(سائنس اور قرآن کی روشنی میں ایک تجزیاتی مطالعہ)

پروفیسر سید مسعود احمد

(۲)

اب ہم قرآن حکیم کی آیات کی روشنی میں ماحولیاتی بحران کے اسباب اور اس کے علاج کے تعلق سے کچھ معروضات پیش کریں گے، اس بحث سے پہلے تمہیدی طور پر یہ یاددہانی مناسب رہے گی کہ قرآن مجید نہ تو سائنس کی کتاب ہے اور نہ ماحولیاتی بحران اور اس کے حل کا کوئی اصطلاحی مکتوب Document، بلکہ یہ رب العالمین کی طرف سے اس کی مکرم، باشعور، بااختیار مخلوق کے لیے آخری ومکمل ہدایت نامہ ہے، جس کا اپنا ایک منفرد اسلوب ہے اور جس کو جامع اصطلاح میں کلی ادبی اسلوب (Holistic Literary Style & Approach) کہہ سکتے ہیں، طوالت کے خوف سے ہم یہاں قرآن مجید کی بیسیوں متعلقہ آیات میں سے چند آیات ہی پیش کریں گے:

۱- کائنات میں توازن (Balance & Equilibrium) کا وجود اور اس کو قائم رکھنے کا حکم

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى الَّذِي خَلَقَ فَسَوَّى وَالَّذِي قَدَّرَ فَهَدَى (الاعلیٰ:۱-۳)

تسبیح بیان کرو اپنے برتر رب کی جس نے تخلیق کی اور تناسب قائم کیا اور جس نے اندازہ مقرر کیا اور ہدایت بخشی۔

وَالسَّمَاءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيزَانَ أَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيزَانِ (الرحمٰن:۷-۸)

اور آسمان بلند کیا اور میزان قائم کی اور حکم دیا کہ اس میزان میں کسی قسم کی سرکشی نہ ہو۔

شعبہ بایوکیمسٹری، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ۔

إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ (القمر:۴۹-الرعد:۱۳)

ہم نے ہر چیز ایک تقدیر (اندازہ) کے ساتھ پیدا کی ہے۔

وَالْأَرْضَ مَدَدْنَاهَا وَأَلْقَيْنَا فِيهَا رَوَاسِيَ وَأَنْبَتْنَا فِيهَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَوْزُونٍ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ وَمَنْ لَسْتُمْ لَهُ بِرَازِقِينَ (الحجر:۱۹-۲۰)

اور ہم نے زمین کو پھیلایا اور اس میں پہاڑ جمادیے اور ہر چیز موزوں و متناسب انداز میں اُگائیں اور ہم نے اس میں تمہارے لیے معیشت کے سامان مہیا کیے اور ان کے لیے جن کی ذمہ داری تم پر نہیں ہے۔

...... إِلَّا بِقَدَرٍ مَعْلُومٍ (الحجر:۲۱)

...... جس چیز کو بھی ہم نازل کرتے ہیں ایک مقرر مقدار ہی میں نازل کرتے ہیں۔

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ ...... بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنَ السَّمَاءِ ...... وَتَصْرِيفِ الرِّيَاحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ ...... لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ (البقرہ:۱۶۴)

یقیناً زمین اور آسمانوں کی خلقت میں اور گردش لیل ونہار میں، ان کشتیوں میں جو انسان کی نفع کی چیزیں لیے ہوئے دریاؤں اور سمندروں میں چلتی پھرتی رہتی ہیں، بارش کے اس پانی میں جسے اللہ اوپر سے برساتا ہے، پھر اس کے ذریعہ سے مردہ زمین کو زندگی بخشتا ہے اور زمین میں ہر قسم کے جاندار مخلوق کو پھیلاتا ہے، ہواؤں کی گردش میں اور ان بادلوں میں جو زمین اور آسمان کے درمیان تابع فرمان بنا کر رکھے گئے ہیں، بے شمار نشانیاں ہیں۔

۲- بغی وفساد کی ممانعت اور احسان کا مطالبہ اور خوش حالی میں استحصالی رویہ (ترف) کی مذمت۔

إِنَّ قَارُونَ كَانَ مِنْ قَوْمِ مُوسَى

یہ ایک واقعہ ہے کہ قارون موسیٰ کی قوم کا

فَبَغٰی عَلَیۡهِمۡ ...... وَلَا تَبۡغِ الۡفَسَادَ فِی الۡاَرۡضِ ...... وَلَا تَنۡسَ نَصِیۡبَکَ مِنَ الدُّنۡیَا ...... وَاَحۡسِنۡ کَمَاۤ اَحۡسَنَ اللّٰهُ اِلَیۡکَ ...... اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الۡمُفۡسِدِیۡنَ

(القصص:۷۶-۷۷)

ایک شخص تھا، وہ اپنی قوم کے خلاف سرکش ہوگیا جو مال اللہ تعالیٰ نے مجھے دیا ہے اس سے آخرت کا گھر بنانے کی فکر کر اور دنیا سے بھی اپنا حصہ فراموش نہ کر، احسان کر جس طرح اللہ تعالیٰ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے اور زمین میں فساد برپا کرنے کی کوشش نہ کر کہ اللہ تعالیٰ مفسدین کو پسند نہیں کرتا۔

مَنۡ قَتَلَ نَفۡسًۢا بِغَیۡرِ نَفۡسٍ اَوۡ فَسَادٍ فِی الۡاَرۡضِ فَکَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِیۡعًا وَمَنۡ اَحۡیَاهَا فَکَاَنَّمَاۤ اَحۡیَا النَّاسَ جَمِیۡعًا

(المائدہ:۳۲)

جس نے کسی انسان کو خون کے بدلے یا زمین میں فساد پھیلانے کے سوا کسی اور وجہ سے قتل کیا، اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کردیا اور جس نے کسی کی جان بچائی اس نے گویا تمام انسانوں کو زندگی بخش دی۔

اس آیت کی رو سے جہاں ایک انسان کا قتل دنیائے انسانیت کے قتل کے مترادف ہے وہیں ''فساد فی الارض'' کا مرتکب بھی گویا قتل انسانیت کا مرتکب ہے اور ماحولیاتی تناظر میں یہ بات اب محتاج ثبوت نہیں، دوسرے یہ کہ فساد فی الارض کا مرتکب بدترین سزا کا مستحق ہے، قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے کم وبیش پچاس مقامات پر فساد کی قباحت وشناعت کا واضح الفاظ میں ذکر کیا ہے اور یہ بات بار بار کہی گئی ہے کہ

اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الۡفَسَادَ (البقرہ:۲۰۵)

در حقیقت اللہ تعالیٰ فساد کو بالکل پسند نہیں کرتا۔

اور

وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ الۡمُفۡسِدِیۡنَ (البقرہ:۲۰۵)

اور اللہ تعالیٰ فساد کرنے والوں کو ہرگز پسند نہیں کرتا۔

فَلَوۡلَا کَانَ مِنَ الۡقُرُوۡنِ مِنۡ قَبۡلِکُمۡ

پھر کیوں نہ ان قوموں میں جو تم سے پہلے گزر

اُولُوۡا بَقِیَّةٍ یَّنۡهَوۡنَ عَنِ الۡفَسَادِ فِی الۡاَرۡضِ اِلَّا قَلِیۡلًا مِّمَّنۡ اَنۡجَیۡنَا مِنۡهُمۡ وَاتَّبَعَ الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا مَاۤ اُتۡرِفُوۡا فِیۡهِ وَکَانُوۡا مُجۡرِمِیۡنَ

(ہود:۱۱۶)

چکی ہیں، ایسے اہل خیر موجود ہیں جو لوگوں کو زمین میں فساد کرنے سے روکتے؟ ایسے لوگ نکلے بھی تو کم جن کو ہم نے ان قوموں میں سے بچالیا ورنہ ظالم لوگ تو انہیں مزوں کے پیچھے پڑے رہے جن کے سامان انہیں فراوانی کے ساتھ دیے گئے تھے اور وہ مجرم بن کر رہے۔

۳- موجودہ ماحولیاتی بحران کی بہترین تصویر کشی قرآنی آیات کے آئینہ میں بجز اس فرق کے کہ یہ سب کچھ طبیعیاتی میدان میں ہے اور وہ اخلاقی تناظر میں۔

ظَهَرَ الۡفَسَادُ فِی الۡبَرِّ وَالۡبَحۡرِ بِمَا کَسَبَتۡ اَیۡدِی النَّاسِ لِیُذِیۡقَهُمۡ بَعۡضَ الَّذِیۡ عَمِلُوۡا لَعَلَّهُمۡ یَرۡجِعُوۡنَ (الروم:۴۱)

خشکی اور تری میں فساد رونما ہوگیا ہے لوگوں کے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے، تاکہ (اللہ تعالیٰ) مزہ چکھائے ان کو ان کے بعض اعمال کا، شاید کہ باز آجائیں۔

اَلَّذِیۡنَ طَغَوۡا فِی الۡبِلَادِ فَاَکۡثَرُوۡا فِیۡهَا الۡفَسَادَ فَصَبَّ عَلَیۡهِمۡ رَبُّکَ سَوۡطَ عَذَابٍ (الفجر:۱۱-۱۳)

اور ان لوگوں نے بستیوں میں سرکشی کی تھی اور ان میں بہت فساد پھیلایا تھا، آخر کار تمہارے رب نے ان پر عذاب کا کوڑا برسادیا

ان آیات میں بلاشبہ سماجی فساد کے حوالہ سے بات ہو رہی ہے اور فساد کے اخلاقی نتائج کے لیے قرآنی ثبوت فراہم کیا گیا ہے مگر قرآن کریم کی روشنی میں اس کائنات کی اشیا اور اس کے مظاہر (Manifestatiors) نیز تاریخی واقعات ''آیات اللہ'' ہیں اور ان غیبی حقائق اور آفاقی صداقتوں (Ultimate Truths) کی طرف رہنمائی کرتے ہیں جو قرآن کریم کی اساسی بنیادیں ہیں اس لحاظ سے قرآن حکیم جب اخلاقی سطح پر ظہور پذیر ''سنت اللہ'' کا تذکرہ کرتا ہے تو طبیعاتی سطح پر ہونے والے واقعات بھی اس تحت آجاتے ہیں اور ان ہی حقائق کو تائید فراہم کرتے ہیں کیوں کہ ساری کائنات ''جامع توحیدیت'' کا مظہر ہے اور ہر سطح پر اللہ تعالیٰ کے اس پلان اور مقصد (Purpose) کو پورا کرتی ہے جس کے تحت یہ پورا کارخانہ وجود قائم کیا گیا ہے۔

۴- اللہ تعالیٰ اسراف وتبذیر کو پسند نہیں کرتا جب کہ یہ فی زمانہ صارفیت، اباحیت اور ہمہ جہتی عدم توازن کے خاص طور سے ذمہ دار ہیں۔

كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ
(اعراف:۳۱)

کھاؤ پیو اور حد سے تجاوز نہ کرو کہ (اللہ تعالیٰ) مسرفین کو پسند نہیں کرتا۔

وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا
(بنی اسرائیل:۲۷)

فضول خرچی نہ کرو، فضول خرچ لوگ شیطان کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا ناشکرا ہے۔

قرآن مجید میں سَرَفَ، یُسرِفُ اور اسراف و مُسرفین سے متعلق تئیس مقامات پر تذکرہ ہے اور ایک جگہ واضح طور پر فرمایا کہ

اَهْلَكْنَا الْمُسْرِفِيْنَ (الانبیاء:۹)

ہم نے مسرفین کو ہلاک کر دیا۔

۵- انسان خلیفۃ اللہ فی الارض ہے اور اللہ تعالیٰ نے کائنات کی ہر شے اس کے زیر نگیں کردی ہے اور اس کے حسن عمل کا امتحان ہو رہا ہے لیکن ان تمام چیزوں کی معرفت علم ہدایت اور وحی الٰہی کے بغیر ممکن نہیں۔

وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ ...... لِيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَا اٰتٰىكُمْ ...... اِنَّ رَبَّكَ سَرِيْعُ الْعِقَابِ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ
(الانعام:۱۶۵)

وہی ہے جس نے تم کو زمین کا خلیفہ بنایا اور تم میں سے بعض کو بعض کے مقابلہ میں زیادہ بلند درجے دیے، تاکہ جو کچھ تم کو دیا ہے اس میں تمہاری آزمائش کرے، بے شک تمہارا رب سزا دینے میں بھی بہت تیز ہے اور بہت درگزر اور رحم فرمانے والا بھی ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے خلافت کے ناجائز استعمال پر سریع العقاب کی وعید سنائی ہے اور خلافت کا ناجائز استعمال عموماً کائنات میں استحصالی رویہ کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے اور

سریع العقاب میں آخرت کی پکڑ کے ساتھ دنیا کے عذاب کا اشارہ بھی ملتا ہے۔

اَلَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفُوْرُ
(الملک:۲)

وہی ہے جس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ تم لوگوں کو آزما کر دیکھے کہ تم میں کون بہتر عمل کرنے والا ہے۔

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً قَالُوْا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاۗءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ قَالَ اِنِّيْ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَاۗءَ كُلَّهَا
(البقرہ:۳۰-۳۱)

پھر ذرا اس وقت کا تصور کرو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا تھا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ مقرر کرنے والا ہوں، انہوں نے عرض کیا، کیا آپ زمین میں کسی ایسے کو مقرر کرنے والے ہیں جو اس کے انتظام کو بگاڑ دے گا اور خوں ریزیاں کرے گا، آپ کی حمد وثنا کے ساتھ تسبیح اور آپ کی تقدیس تو ہم کر ہی رہے ہیں، فرمایا: میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے آدم کو ساری چیزوں کے نام سکھائے۔

اس آیت میں آدمؑ کی خلافت کے ساتھ فساد کا اندیشہ اور اس فساد سے روک ٹوک کے انتظام کا تذکرہ بالکل واضح ہے، اسی رکوع کی اگلی آیات کے ذریعہ معلوم ہوتا ہے کہ دنیوی علوم اور عقل انسانی انسان کو اغوائے شیطانی سے بچانے میں ناکافی ہیں، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کے ذریعہ ہدایت بھیج کر انسان کو فساد اور اس کے نتائج سے آگاہ کیا ہے، اسی علم ہدایت اور وحی الٰہی پر مبنی نظام حیات اور علوم ہی حقیقی کامیابی اور ترقی کی ضمانت دے سکتے ہیں اور پائدار حل کے لیے بنیاد بھی فراہم کر سکتے ہیں۔

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ

کیا تم لوگ نہیں دیکھتے کہ اللہ نے زمین اور آسمانوں کی ساری چیزیں تمہارے لیے

وَاَسۡبَغَ عَلَيۡكُمۡ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يُّجَادِلُ فِى اللّٰهِ بِغَيۡرِ عِلۡمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيۡرٍ (لقمان : ۲۰)

مسخر کر رکھی ہیں اور اپنی کھلی اور چھپی نعمتیں تم پر تمام کردی ہیں، اس پر حال یہ ہے کہ انسانوں میں سے کچھ لوگ ہیں جو اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہیں بغیر اس کے کہ ان کے پاس کوئی علم ہو یا ہدایت یا کوئی روشنی دکھانے والی کتاب۔

مولانا مودودیؒ اس آیت کے ذیل میں فرماتے ہیں کہ کسی چیز کو مسخر کرنے کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں، ایک یہ کہ وہ چیز اس کے تابع کردی جائے اور اسے اختیار دے دیا جائے کہ جس طرح چاہے اس میں تصرف کرے اور جس طرح چاہے اسے استعمال کرے، دوسری یہ کہ اس چیز کو ایسے ضابطہ کا پابند کردیا جائے جس کی بدولت وہ اس شخص کے لیے نافع ہوجائے اور اس کے مفاد کی خدمت کرتی رہے، زمین و آسمان کی تمام چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے ایک ہی معنی میں مسخر نہیں کردیا ہے بلکہ بعض چیزیں پہلے معنی میں مسخر کی ہیں اور بعض دوسرے معنی میں، مثلاً ہوا، پانی، مٹی، آگ، نباتات، معدنیات، مویشی وغیرہ بے شمار چیزیں پہلے معنی میں ہمارے لیے مسخر ہیں اور چاند، سورج وغیرہ دوسرے معنی میں۔ (ترجمہ قرآن مجید، مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی ص ۱۰۴۳-۱۰۴۵)

قرآن حکیم میں سَخَّرَ، یُسَخِّرُ اور مسخر کے مشتقات چوبیس آیات میں ملتے ہیں، یہاں یہ عرض کردینا ضروری ہے کہ اسلام تعمیری تسخیر کا علم بردار ہے اور اس تسخیر کا لائسنس رب کائنات ہی سے لینا چاہیے کیونکہ تمام تسخیرات کا اصل منبع وہی ہے اور یہی تعمیری تسخیر ہے، جبکہ تخریبی اور استحصالی تسخیر (Destructive & Exploitative Subjugation) اس کے مزاج سے کسی طرح میل نہیں کھاتیں، اسلامی تعلیمات کی روشنی میں کائنات کی تمام چیزیں جن پر انسان کو تصرف حاصل ہے وہ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہیں اور انسان ان کا مالک نہیں بلکہ امین (Trustee) ہے اور ان کے بارے میں اس کو اللہ تعالیٰ کے حضور جواب دہی کرنا ہے، یہاں اس تفصیل کی ضرورت اس لیے بھی محسوس ہوئی کیونکہ راشیل کارسن کی دھماکہ خیز کتاب خاموش موسم بہار (Silent Spring) کی اشاعت پر جو پہلا ردعمل آیا وہ ملحد و مذہب بیزار گروہ کی طرف سے ہی آیا، جس کے سرخیل پروفیسر لن وہائٹ جونیر

(Lynn White Jr.)، ٹیلر (A.M. Taylor, D.M. Taylor)، مک ہارگ (McHarg) اور آرنالڈ ٹائن بی (Arnold Toynbee) تھے (۱)، جنھوں نے مذہب کو عموماً اور جوڈیو-کرسچینٹی کو خصوصاً نشانہ بنایا، پروفیسر لن وہائٹ جونیر نے اپنے مقالہ بہ عنوان "ماحولیاتی بحران کی تاریخی بنیادیں" مطبوعہ ۱۹۶۷ (The historical roots of Ecological crisis, Published in 1967) میں عیسائیت کے استحصال فطرت کے تعلق سے جواز کو مورد الزام ٹھہرایا ہے اور اس گروہ کے دوسرے افراد ابراہیمی مذاہب میں اسلام کو بھی شامل کرتے ہوئے تسخیر اور خلافت کی اصطلاحوں کو غلط معنی پہنا کر اسلام سے برگشتہ کررہے ہیں۔

۶- فطرت سے ہم آہنگی مطلوب ہے نہ کہ جنگ، اور اسلام دین فطرت ہے جس کو کلی طور پر اختیار کرکے ہی حقیقی فلاح و نجات ممکن ہے۔

فَاَقِمۡ وَجۡهَكَ لِلدِّيۡنِ حَنِيۡفًا فِطۡرَتَ اللّٰهِ الَّتِىۡ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيۡهَا لَا تَبۡدِيۡلَ لِخَلۡقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّيۡنُ الۡقَيِّمُ (الروم: ۳۰)

پس یک سو ہو کر اپنا رخ اس دین کی سمت میں جمادو، قائم ہوجاؤ اس فطرت پر جس پر اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے، اللہ کی بنائی ہوئی ساخت بدلی نہیں جاسکتی، یہی بالکل راست اور درست دین ہے۔

قرآن مجید میں پچاسوں مقامات پر عبادت، تسبیح، تحمید اور سجدہ کو کائنات کی ہر شی کی فطرت قرار دیا گیا ہے اور انسان سے یہ مطالبہ ہے کہ وہ فطرت کائنات سے ہم آہنگی اختیار کرتے ہوئے رب العالمین ہی کی عبادت، تسبیح، تحمید اور سجدہ کرے (مثال کے طور پر بنی اسرائیل-۴۴، الرعد-۱۳ وغیرہ دیکھیے)، زیر غور مسئلہ کے تناظر میں ان آیات میں اشارہ ہے کہ ماحول سے ہم آہنگی انسانی فطرت کا خاصہ ہے۔

۷- انسان کو اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں اپنی امانت کا امین بنایا ہے اور اس کا مطالبہ ہے کہ امانت میں خیانت کا ارتکاب نہ ہو

اِنَّا عَرَضۡنَا الۡاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَالۡجِبَالِ

ہم نے اس امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا تو وہ اسے اٹھانے

فَاَبَیْنَ اَنْ یَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا (الاحزاب: ۷۲)

کے لیے تیار نہ ہوئے اور اس سے ڈر گئے مگر انسان نے اسے اٹھالیا، بے شک وہ بڑا ظالم اور جاہل ہے۔

اس آیت کے تعلق سے مولانا مودودیؒ رقم طراز ہیں کہ: "امانت سے مراد ہے ان ذمہ داریوں کا بار جو اللہ تعالیٰ نے اپنی زمین میں اختیارات اور عقل دے کر انسان پر ڈالی ہیں (حاشیہ ۲۲) ظَلُوْمًا جَهُوْلًا یعنی اس بار امانت کا حامل ہو کر بھی اپنی ذمہ داری محسوس نہیں کرتا اور خیانت کر کے اپنے اوپر آپ ظلم کرتا ہے۔ (حاشیہ ۲۳، ترجمہ قرآن مجید، مطبوعہ مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی، ص ۱۰۸۱)

وَالَّذِیْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ (المومنون: ۸)

اور جو اپنی امانتوں اور عہد و پیمان کا پاس رکھتے ہیں، یعنی وہی مومن ہیں اور یقینا کامیاب ہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤى اَهْلِهَا (النساء: ۵۷)

یقیناً اللہ تعالیٰ تمہیں (اے مسلمانو) حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہل امانت کے سپرد کرو۔

۸- تکریم بنی آدم ایک ایسا اعزاز ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس لیے عطا کیا ہے کہ وہ اپنے سامان زیست اور مسائل حیات بہترین طریقوں پر پایہ تکمیل کو پہنچا سکے اور تسخیر کائنات کا مقصد بھی خلافت ارضی کی ذمہ داریوں کو کما حقہ ادا کرنے کی صلاحیت دینا اور ان دونوں امتیازی مناصب کے ذریعہ انسان کے حسن عمل اور شکر گزاری کا امتحان لینا ہے۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِیْۤ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِیْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِیْلًا (بنی اسرائیل: ۷۰)

یہ تو ہماری عنایت ہے کہ ہم نے بنی آدم کو بزرگی دی اور انہیں خشکی اور تری میں سواریاں عطا کیں اور ان کو پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا اور بہت سی مخلوقات پر نمایاں فوقیت بخشی۔

وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِیَ فِی الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ

(اللہ وہی تو ہے جس نے) کشتی کو تمہارے لیے مسخر کیا کہ سمندر میں اس کے حکم سے چلے

وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَیْنِ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ (ابراہیم: ۳۲-۳۴)

اور دریاؤں کو تمہارے لیے مسخر کیا جس نے سورج اور چاند کو تمہارے لیے مسخر کیا کہ لگاتار چلے جا رہے ہیں اور رات اور دن کو تمہارے لیے مسخر کیا، جس نے وہ سب کچھ تمہیں دیا جو تم نے مانگا، اگر تم اللہ کی نعمتوں کا شمار کرنا چاہو تو نہیں کر سکتے، حقیقت یہ ہے کہ انسان بڑا ہی بے انصاف اور ناشکرا ہے۔

مزید دیکھیے (النحل ۱۴) اور (الجاثیہ ۱۲) جن میں لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ آیا ہے۔

تسخیر کی آیات میں "لام" کا صلہ خصوصاً اللہ تعالیٰ کے کرم کی نشان دہی کرتا ہے اور لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ اور لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ جیسے آخری ٹکڑے یہ یاد دہانی کراتے ہیں کہ ان نعمتوں کا صحیح استعمال اور تشکرانہ رویہ یہ ہے کہ ان کا غیر فطری استحصال نہ ہو۔

۹- تخلیق میں تنوع اور رنگارنگی (Unity in Diversity) کا ثبوت اور اصول زوجیت (Principle of Pairing & Complementarity) کمال خداوندی (Divine Perfection) کا ثبوت ہے، ان ثبوتوں کو مٹانا گویا اللہ تعالیٰ سے جنگ کرنا ہے، بایوڈایورسٹی (Biodiversity) کی حفاظت آیات اللہ کی حفاظت ہے اور اس سے پہلوتہی اللہ تعالیٰ کی ناراضگی مول لے کر اپنی ہلاکت کا سامان کرنا ہے۔

وَفِی الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّجَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّزَرْعٌ وَّنَخِیْلٌ صِنْوَانٌ وَّغَیْرُ صِنْوَانٍ یُّسْقٰى بِمَآءٍ وَّاحِدٍ وَّنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰى بَعْضٍ فِی الْاُكُلِ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ (الرعد: ۴)

زمین میں الگ الگ خطے پائے جاتے ہیں جو ایک دوسرے سے متصل واقع ہیں، انگور کے باغ ہیں، کھیتیاں ہیں، کھجور کے درخت ہیں جن میں سے کچھ اکہرے ہیں اور کچھ دوہرے سب کو ایک ہی پانی سیراب کرتا ہے مگر مزے میں ہم کسی کو بہتر بنا دیتے ہیں اور کسی کو کمتر، ان سب چیزوں میں نشانیاں ہیں، ان لوگوں

کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔

وَمَا ذَرَاَ لَكُمْ فِى الْاَرْضِ مُخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ (النحل:۱۳)

اور یہ جو بہت سی رنگ برنگ کی چیزیں اس نے تمہارے لیے زمین میں پیدا کر رکھی ہیں، ان میں بھی ضرور نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو سبق حاصل کرنے والے ہیں۔

مزید دیکھیے (سورۃ الانعام:۹۹) اور (النحل:۸) وغیرہ۔

۱۰- پائدار ترقی (Sustainable Development) کتاب فطرت اور کتاب الٰہی کو پڑھ کر اس کے مطابق عمل کرنے میں مضمر ہے، اگر انسان کائنات کا فطری توازن قائم رکھے تو اللہ تعالیٰ (الرحمٰن) اپنی رحمت کا سایہ قائم رکھے گا اور نئی نئی راہیں سجھائے گا مگر یہ رحمت ایمان باللہ اور تقویٰ سے مشروط ہے۔

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰۤى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (الاعراف:۹۶)

اگر بستیوں کے لوگ ایمان لاتے اور تقویٰ کی روش اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین سے برکتوں کے دروازے کھول دیتے مگر انہوں نے تو جھٹلایا، لہٰذا ہم نے اس بری کمائی کے حساب میں انہیں پکڑ لیا جو وہ سمیٹ رہے تھے۔

اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ خَلَقَ الْاِنْسَانَ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ وَالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدٰنِ وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ اَلَّا تَطْغَوْا فِى الْمِيْزَانِ (الرحمٰن:۱تا۸)

وہ نہایت مہربان خدا ہے جس نے اس قرآن کی تعلیم دی ہے، اسی نے انسان کو پیدا کیا اور اسے بولنا سکھایا، سورج اور چاند ایک حساب کے پابند ہیں اور تارے (یا نباتات) اور درخت سب سجدہ ریز ہیں، آسمان کو اس نے بلند کیا اور میزان قائم کردی، اس کا تقاضا ہے کہ تم میزان میں خلل نہ ڈالو۔

ہماری ناقص رائے میں اس مجموعہ آیات میں ماحولیاتی بحران کا بنیادی اور اس کا بہترین

حل مضمر ہے، جہاں تک ماحولیاتی بحران کا تعلق اور توازن قائم رکھنے کا معاملہ ہے، وہ تو اس مضمون میں کئی جگہ وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ اَلَّا تَطْغَوْا فِى الْمِيْزَانِ کے ذیل میں پیش کیا گیا ہے، یہ قرآن حکیم کا اعجاز ہے کہ انہیں آیات میں اس بحران سے نبٹنے کے کچھ اشارے بھی موجود ہیں جنہیں ہم ٹی - ایس کہن اور ڈاکٹر ریاض کرمانی کی اصطلاح میں اشاراتی گردان Hint (Paradigm) (۲) سے منسوب و موسوم کرسکتے ہیں، حالانکہ یہ بحث الگ سے ایک مضمون کا مطالبہ کرتی ہے، البتہ ہمارا خیال ہے کہ سورج اور چاند کی امتیازی خصوصیات کا استعمال کرتے ہوئے اور نباتات اور درختوں کے زہریلی گیسوں کے انجذاب اور فرحت بخش آکسیجن کو بنانے کا نظام بروئے کار لاتے ہوئے اور بایوڈائیورسٹی کو قائم رکھتے ہوئے نیز قدرتی فضائی سائیکل کو قائم رکھتے ہوئے اگر کوششیں کی جائیں تو ضرور بارآور ہوں گی، بشرطیکہ قرآن مجید کی تعلیمات اور اس کے اشاروں کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی رحمت مانگی جائے اور اپنی علمی کم مائگی کے اعتراف کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے مزید علم کی درخواست بھی کی جائے وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِىْ عِلْمًا (طٰہٰ:۱۱۴) اور ظاہر ہے کہ یہ (Paradigm Shift) ہمیں ایسی کیسی اور کتنی راہیں دکھاتا ہے جو حیرت انگیز اور بے شمار ہیں، اس طرح کے اشارے قرآن حکیم میں کتنے اور کہاں ہیں یہ تو وقت کے پردوں میں مستور ہیں، البتہ ہمارا حقیر مطالعہ اور یقین ہے کہ یہ بے شمار ہیں۔

۱۱- اسلام کی تعلیمات نفس انسانی اور اس کے ماحول میں وہ طہارت و نظافت قائم کرنا چاہتی ہیں جو ہمہ گیر اور ہمہ جہت ہیں، طہارت جیسی جامع اصطلاح کسی مذہب، نظریہ و نظام زندگی میں نہیں ملتی اور اس کے مترادفات مثلاً تزکیہ، زکوۃ، طیبات وغیرہ کی اہمیت بھی ناقابل انکار ہے، طہارت کی اہمیت اس حقیقت سے مزید واضح ہوتی ہے کہ نبی اکرم کی احادیث مطہرہ پر مدون کتابوں میں عام طور سے کتاب الطہارۃ سب سے پہلا باب ہوتا ہے، اسلام ہر قسم کی آلودگیوں بشمول مادی آلودگی کے انسانی زندگی اور اس کے ماحول سے سخت متنفر ہے اور ان سے انسانوں کو بچنے اور دور رہنے کی تلقین کرتا ہے اور صاف ستھرے اور فطری ماحول کی پرزور وکالت کرتا ہے اور جنت بھی انہیں میں سے ہے۔

وَهُوَ الَّذِىْ اَرْسَلَ الرِّيٰحَ بُشْرًا

اور وہی ہے جو اپنی رحمت کے آگے آگے

بَيۡنَ يَدَىۡ رَحۡمَتِهٖ وَاَنۡزَلۡنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوۡرًا لِّنُحۡیِۦَ بِهٖ بَلۡدَةً مَّيۡتًا وَّنُسۡقِيَهٗ مِمَّا خَلَقۡنَاۤ اَنۡعَامًا وَّاَنَاسِىَّ كَثِيۡرًا (الفرقان:۴۸-۴۹)

ہواؤں کو بشارت بنا کر بھیجتا ہے، پھر آسمان سے پاک پانی (ماء طهورا) نازل کرتا ہے تاکہ ایک مردہ علاقہ کو اس کے ذریعہ زندگی بخشے اور اپنی مخلوق میں سے بہت سے جانوروں اور انسانوں کو سیراب کرے۔

فِيۡهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوۡنَ اَنۡ يَّتَطَهَّرُوۡا وَاللّٰهُ يُحِبُّ الۡمُطَّهِّرِيۡنَ (التوبہ:۱۰۸)

اس میں ایسے لوگ ہیں جو پاک رہنا پسند کرتے ہیں اور اللہ کو پاکیزگی اختیار کرنے والے ہی پسند ہیں۔

لَّا يَمَسُّهٗۤ اِلَّا الۡمُطَهَّرُوۡنَ (واقعہ:۷۹)

اس (قرآن) کو پاکیزہ ہی لوگ چھوتے ہیں۔

يٰۤاَيُّهَا الۡمُدَّثِّرُ ...... وَثِيَابَكَ فَطَهِّرۡ وَالرُّجۡزَ فَاهۡجُرۡ (المدثر:۱تا۵)

اے اوڑھ لپیٹ کر لیٹنے والے اٹھ اور تکبیر بیان کر اپنے رب کی اور اپنے کپڑے پاک رکھ اور گندگی سے دور رہ۔

مَثَلُ الۡجَنَّةِ الَّتِىۡ وُعِدَ الۡمُتَّقُوۡنَ فِيۡهَاۤ اَنۡهٰرٌ مِّنۡ مَّآءٍ غَيۡرِ اٰسِنٍ وَاَنۡهٰرٌ مِّنۡ لَّبَنٍ لَّمۡ يَتَغَيَّرۡ طَعۡمُهٗ (محمد:۱۵)

پرہیزگاروں کے لیے جس جنت کا وعدہ کیا گیا ہے اس کی شان تو یہ ہے کہ اس میں نہریں بہ رہی ہوں گی، ستھرے ہوئے (صاف) پانی کی نہریں بہ رہی ہوں گی ایسے دودھ کی جس کے مزے میں ذرا فرق نہ آیا ہوگا۔

لَقَدۡ كَانَ لِسَبَاٍ فِىۡ مَسۡكَنِهِمۡ اٰيَةٌ جَنَّتٰنِ عَنۡ يَّمِيۡنٍ وَّشِمَالٍ كُلُوۡا مِنۡ رِّزۡقِ رَبِّكُمۡ وَاشۡكُرُوۡا لَهٗ بَلۡدَةٌ طَيِّبَةٌ وَّرَبٌّ غَفُوۡرٌ (سبا:۱۵)

سبا کے لیے ان کے مسکن ہی میں ایک نشانی موجود تھی، دو باغ دائیں اور بائیں، کھاؤ اپنے رب کا رزق اور شکر بجالاؤ اس کا، ملک ہے عمدہ و پاکیزہ اور پروردگار ہے بخشش فرمانے والا۔

ہم نے طهر، يطهر پر مشتمل چند آیات بہ طور مثال پیش کی ہیں، قرآن مجید میں ان

کے مشتقات تیس مقامات پر، طیبات و طیب کے مشتقات چالیس مقامات پر اور ذکی، تزکیہ، زکوٰۃ وغیرہ کے مشتقات چھپن مقامات پر ملتے ہیں۔

۱۲- اسلام سبقت فی الخیرات، اجتناب من الضرر اور اقرب من النفع کا حامی ہے، ماحولیات کے تعلق سے ان تمام اعمال اور ٹکنالوجی کو ان تین پیمانوں پر تولنے سے اکثر و بیشتر مسائل حل ہو سکتے ہیں، اچھی چیزوں کو نہ صرف اختیار کرنا بلکہ ان کے لیے سبقت کا رویہ، جہاں کسی ضرر کا اندیشہ ہو اس سے اجتناب اور جہاں کہیں معاملہ تقابل (Comparism) کا ہو وہاں نفع و نقصان کو ضرورت سے جوڑتے ہوئے بہتر فیصلہ کا حکم قرآن مجید دیتا ہے، چند آیات ملاحظہ ہوں:

يَسۡـَٔلُوۡنَكَ عَنِ الۡخَمۡرِ وَالۡمَيۡسِرِ قُلۡ فِيۡهِمَاۤ اِثۡمٌ كَبِيۡرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثۡمُهُمَاۤ اَكۡبَرُ مِنۡ نَّفۡعِهِمَا (البقرہ:۲۱۹)

پوچھتے ہیں شراب اور جوئے کا کیا حکم ہے، کہو ان دونوں چیزوں میں بڑی خرابی ہے، اگرچہ ان میں لوگوں کے لیے کچھ منافع بھی ہیں، مگر ان کا گناہ ان کے فائدہ سے بہت زیادہ ہے۔

يَدۡعُوۡا لَمَنۡ ضَرُّهٗۤ اَقۡرَبُ مِنۡ نَّفۡعِهٖ لَبِئۡسَ الۡمَوۡلٰى وَلَبِئۡسَ الۡعَشِيۡرُ (الحج:۱۳)

وہ ان کو پکارتا ہے جن کا نقصان ان کے نفع سے قریب تر ہے، بدترین ہے اس کا مولیٰ اور بدترین ہے اس کا رفیق۔

وَمَا تُقَدِّمُوۡا لِاَنۡفُسِكُمۡ مِّنۡ خَيۡرٍ تَجِدُوۡهُ عِنۡدَ اللّٰهِ هُوَ خَيۡرًا وَّاَعۡظَمَ اَجۡرًا (المزمل:۲۰)

جو کچھ بھلائی تم اپنے لیے آگے بھیجوگے اسے اللہ تعالیٰ کے ہاں موجود پاؤگے، وہی زیادہ بہتر ہے اور اس کا اجر بہت بڑا ہے۔

وَلِكُلٍّ وِّجۡهَةٌ هُوَ مُوَلِّيۡهَا فَاسۡتَبِقُوا الۡخَيۡرٰتِ (البقرہ:۱۴۸)

ہر ایک کے لیے ایک رخ ہے جس کی طرف وہ مڑتا ہے پس تم بھلائیوں کی طرف سبقت کرو۔

وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيۡدٌ (البقرہ:۲۸۲)

...... کاتب اور گواہ کو ستایا نہ جائے۔

وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِى الۡاَرۡضِ لِيُفۡسِدَ فِيۡهَا وَيُهۡلِكَ الۡحَرۡثَ وَالنَّسۡلَ (البقرہ:۲۰۵)

(اس دشمن حق) کو جب اقتدار حاصل ہوجاتا ہے تو زمین میں اس کی ساری دوڑ دھوپ اس لیے ہوتی ہے کہ فساد پھیلائے کھیتوں کو غارت کرے اور نسل انسانی کو تباہ کرے۔

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ
وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ
(الزلزال: ۷و۸)

تو جس نے ذرہ برابر نیکی (خیر) کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ برابر بدی (شر) کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا۔

قرآن کریم میں خیر اور خیرات کے مشتقات ایک سو اسّی جگہ وارد ہوئے ہیں اور نفع ینفع اور منافع کے مشتقات پچاس جگہ ملتے ہیں۔

۱۳- قرآن کریم جملہ بحرانوں اور مسائل و مصائب سے نکلنے کے لیے توبہ اور دعا کے ساتھ ساتھ انسانوں کو اس طرف بھی متوجہ کرتا ہے کہ اپنے علم و عمل میں غلطی کے امکانات کو حقیقت سمجھ کر اپنا احتساب کریں اور اپنی اصلاح کی فکر کریں، نیز جملہ نسل انسانی کی اصلاح و فلاح اور خیر خواہی کو ہدف بنا کر خاطر خواہ کوشش بھی کریں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ لْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ (الحشر: ۱۸)
اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور ہر شخص یہ غور کرے کہ اس نے کل کے لیے کیا بھیجا ہے۔

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا (آل عمران: ۱۴۷)
اے ہمارے رب ہماری غلطیوں اور کوتاہیوں سے درگزر فرما اور ہمارے کام میں تیرے حدود سے جو تجاوز ہوگیا ہو اسے معاف کردے۔

اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِيْنَ (قصص: ۱۹)
ہم اصلاح کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتے۔

اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (آل عمران: ۸۹)
(وہ عذاب سے بچ جائیں گے) جو اس کے بعد توبہ کرکے اپنے طرز عمل کی اصلاح کرلیں اللہ غفور رحیم ہے۔

(باقی)

حواشی و مراجع

(۱) عبدالرشید اگوان کی تالیف "Islam & the environment" اور ثمی کنیال کی تالیف بہ عنوان "Environmental Pollution" ملاحظہ ہوں۔

(۲) تھامس کہن کی کتاب "Structure of the Scientific Revolutions" اور ریاض کرمانی صاحب کا مقالہ "Epistemlogical Foundations of Islamic Science" مطبوعہ Maas J. Islamic Science Aligarh، ۱۹۸۷ء، شمارہ نمبر ۳، صفحات ۲۱ سے آگے، نیز اسی میگزین کے شمارہ (۱)، ۱۹۸۹ء، ص ۴۱ تا ۲۸ ملاحظہ ہوں۔

بسملہ - آیاتِ قرآنی میں
شمار و نظم اور تلاوت و قرأت

پروفیسر ڈاکٹر محمد یاسین مظہر صدیقی*

(۲)

بسملہ کی تعداد: اسی سے وابستہ ایک اور مسئلہ بسملہ - بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی مصحف میں تعداد کا ہے، مستقل آیت کریمہ قرار دینے والوں اور ہر سورہ کے درمیان فصل قائم کرنے والوں کے مطابق وہ ایک ایسی آیت کریمہ ہے جو ایک سو تیرہ سورتوں سے قبل لائی گئی ہے اور ہر ایک مقام پر ایک مستقل و خود مختار اور کارگزار آیت ہے، بعض علما قرأت کا خیال ہے کہ وہ صرف سورۂ فاتحہ سے قبل ایک مستقل اور علاحدہ آیت ہے اور دوسری سورتوں سے قبل وہ دہرائی گئی ہے، اسی لیے ان کا خیال ہے کہ سورۂ فاتحہ کے بعد کی سورتوں سے قبل بسملہ کے فصل کی کوئی نشانی، علامت یا اشارت دی جائے اور پوری بسملہ نہ لکھی جائے مگر اس قول شاذ کو کسی نے قبول نہیں کیا، جن علمائے کرام نے اسے ہر سورہ کی اولین آیت قرار دیا ہے ان کے نزدیک بھی اس کی تعداد سورتوں کی تعداد کے برابر ہے، اسی طرح جن علما و مفسرین اور شارحین کے خیال میں وہ صرف سورۂ فاتحہ کی ایک آیت کریمہ و فاتحہ ہے اور بقیہ سورتوں میں وہ برائے فصل و استفتاح و برکت لائی گئی ہے، وہ بھی اس کی تعداد ایک سو تیرہ قرار دینے کے قائل ہیں۔

اس مختصر تجزیے سے اختلاف رائے سے زیادہ یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے کہ غالب اکثریت علما کے نزدیک بسملہ کی مصحف کریم میں کل تعداد ایک سو تیرہ ہے، تعداد سور قرآن کی مانند سوائے

* ادارہ علوم اسلامیہ، مسلم یونی ورسٹی، علی گڈھ۔

سورۂ توبہ کے، مذکورہ بالا طبقات ائمہ ومفسرین میں صرف ایک مختصر طبقہ کا خیال شاذ ہے کہ اس کی تعداد صرف ایک ہے اور اسی پر ان کا اصرار ہے مگر اسے قبولیت حاصل نہیں بلکہ اس کی تردید و تغلیط کے دلائل دوسرے علمائے کرام نے دیے ہیں، ان کا ذکر اوپر آچکا ہے اور پھر تفصیل سے ان کے دلائل کا ذکر آئے گا۔

بسملہ کی ۱۱۳ آیات مستقلہ: تمام دوسرے دلائل و براہین کے علاوہ بسملہ کی ۱۱۳ تعداد کا سب سے بڑا ثبوت اجماع صحابہ ہے، اماماںِ تفسیر طبری، ابن کثیر وغیرہ اور ائمہ حدیث وشارحین ابن حجر عسقلانی وغیرہ کے بیانات اوپر گزر چکے، ان میں یہ قطعی وضاحت ہے کہ صحابہ کرام نے آیت بسملہ کو قرآن مجید میں ہر سورہ سے قبل (سوائے توبہ کے) ایک سو تیرہ بار لکھنے پر اتفاق کیا تھا، صحف صدیقی میں بھی جس کو مصحف امام بھی کہا جاتا ہے کہ وہ بنیادی مدون متن ہے، وہ ایک سو تیرہ بار ہر سورہ سے قبل لکھی گئی تھی اور رسم عثمانی پر مبنی تمام مصاحف میں بھی وہ اتنی ہی بار لکھی گئی اور آج کے تمام متداول، مطبوعہ اور مخطوطہ مصاحف قرآنی میں وہ ایک سو تیرہ بار ہی ثبت کی جاتی ہے، وہ اس حقیقت کو ثابت کرتی ہے کہ بسملہ کی کل تعداد ایک سو تیرہ ہے۔

صحابہ کرام کے اجماع واتفاق اور تعامل سے یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے جیسی کہ بعض علمائے کرام کو ہوئی یا جیسی گمراہی بعض گمراہ فرقوں اور ان کے جدید نمائندوں اور مستشرقین نے پھیلائی کہ یہ صرف صحابہؓ کا کام تھا اور اس کی تدوین کو نبوی تائید حاصل نہ تھی، ان مسلکی ہفوات اور تحقیقی مسامحات کے پیچھے کجی تلاش کرنے کی فطرت کارفرما ہے، روایات حدیث بالخصوص روایات تدوین قرآن بلاشبہ ثابت کرتی ہیں کہ صحابہ کرام کا اجماع واتفاق سنت نبوی پر مشتمل تھا، رسول اکرمؐ ہر سورت بلکہ ہر آیت کو لکھواتے اور یاد کرتے اور کراتے ہی نہ تھے بلکہ اس کا مقام و محل بتاتے تھے، بسملہ کو بھی اسی طرح آپؐ نے ہر سورت سے قبل یاد کیا تھا، حفظ کروایا تھا اور اپنے کاتبین کرام سے لکھوایا بھی تھا، یہی وجہ ہے کہ جب مصاحف عثمانی کی شکل میں آخری تدوین قرآن کا مرحلہ آیا تو سورۂ توبہ سے قبل بسملہ لکھنے کا معاملہ آیا، خلیفہ صادق وامین حضرت عثمانؓ نے اپنے ماہر فن اور عالم قرآن کاتبوں کو ہدایت کی کہ اس سورہ سے قبل بسملہ نہ لکھیں، حضرت خلیفہ سوم کی دلیل مسکت تھی کہ رسول اکرمؐ نے وہاں بسملہ نہیں لکھوائی اور سب نے اس

سے اتفاق کیا، روایات بلکہ حقائق وشواہد تدوین تو اس حد تک سنت نبوی اور کار محمدی کی پیروی کی گواہی دیتے ہیں کہ رسم قرآنی میں ایک ہی لفظ وکلمہ کے املا کے اختلاف کو برقرار رکھا کہ وہ فعل و ارشاد رسالت مآب تھا اور اس سے گریز جائز نہیں۔

بسملہ کی ایک سو تیرہ تعداد کی ایک اور شہادت وگواہی اور ثبوت وسند یہ ہے کہ ہر سورہ کریمہ کے ساتھ بسملہ ضرور نازل ہوئی، ان کو دو طرح کے شواہد میں تقسیم کیا جاسکتا ہے: ایک واضح اور مثبت قسم کے دلائل و براہین ہیں اور دوسرے وہ جن سے بالواسطہ ثابت ہوتا ہے کہ بسملہ ہر سورہ کے ساتھ نازل ہوئی تھی، دوسری قسم میں حضرت ابن عباسؓ وغیرہ کی وہ حدیث گزر چکی جس کے مطابق رسول اکرمؐ بسملہ کے نزول سے ایک سورت کے خاتمہ اور دوسری سورت کے آغاز کا پتہ چلالیتے تھے، بعض صحابہ کرام کی اسی طرح کی معرفت آغاز واختتام سورہ کا ثبوت ملتا ہے۔

متعدد احادیث سے واضح ہوتا ہے کہ رسول اکرمؐ نے ہر سورہ کے نزول کے بعد جب اس کی تلاوت صحابہ کرام یا دوسرے مخاطبین کے سامنے فرمائی تو آغاز سورہ سے قبل بسملہ ضرور تلاوت فرمائی، مختصر سورتوں سے قبل بسملہ کے زبانِ رسالت مآبؐ سے تلاوت وقرأت کرنے کا ذکر زیادہ ملتا ہے جیسے سورہ کوثر کی تنزیل کے وقت اس کی اہمیت وافادیت اجاگر کرتے ہوئے آپؐ نے تلاوت فرمائی تو بسملہ ہی سے آغاز فرمایا تھا، متعدد اماماںِ تفسیر نے بھی اس حقیقت کا واضح اظہار کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر سورہ سے قبل بسملہ کو نازل فرمایا تھا، (طبری تفسیر، ۱/ ۱۱۵-۱۱۷ وما بعد؛ قرطبی تفسیر (احکام القرآن، قاہرہ غیر مورخہ) ۱/ ۹۷ نے لکھا ہے کہ علما کا عقیدہ رقول ہے کہ بسملہ کو اللہ تعالیٰ نے ہر سورت کے آغاز میں بہ طور تقسیم (قسم) نازل کیا ہے (نیز دیگر تفاسیر جیسے رازی جصاص وغیرہ) ایک اہم اور دلچسپ اتفاق یہ ہے کہ کتب حدیث میں سے بخاری اور ترمذی میں مفصل ابواب تفسیر ہیں اور ان میں سے اکثر میں بسملہ ضرور لکھی گئی ہے، بخاری میں جہاں بسملہ کا ذکر نہیں ملتا اس کی وجہ نسخہ / راوی کا اسقاط ہے جیسا کہ حافظ ابن حجر نے سورہ حم، الدخان وغیرہ میں وضاحت کی ہے، (فتح الباری، ۸/ ۷۲۴، نیز دیگر صفحات جلد؛ ترمذی، ابواب تفسیر)۔

نظم قرآن سے شہادت: عام وخاص مفسرین کرام نے بسملہ کی تفسیر وتشریح صرف ایک مقام پر کرنے پر قناعت کی ہے، وہ سورۂ فاتحہ - فاتحہ الکتاب اور ام الکتاب - کا اولین موقع ہے

اور یہ طرز واحد خاصی منطقی بھی لگتی ہے کہ اصل مقام فاتحہ ربسملہ وہی ہے اور باقی ایک سو بارہ مقامات پر وہ دہرائی گئی ہے، لہٰذا دوبارہ یا بار بار کی کیا ضرورت ہے، مگر نظم قرآن کریم کے بعض قدیم ومتوسط ماہرین کرام اور مفسرین عظام نے اس حقیقت کا ادراک کیا کہ بسملہ ہر سورہ مابعد سے پہلے دہرائی ہی نہیں گئی بلکہ از سر نو لائی گئی ہے کہ ہر سورہ کا افتتاح اس کا تقاضا کرتا تھا۔

اب تک خاکسار راقم کو صرف ایسے تین عظیم مفسرین کرام کا پتہ پورے ذخیرۂ تفسیر میں چل سکا ہے، حسن اتفاق ہے کہ ان تینوں اکابر کا تعلق اسلامی تصوف کے ساتھ ساتھ نظم قرآن کریم کے ساتھ بھی استوار ہے، وہ ہیں: ۱- امام قشیری (عبدالکریم بن ہوازن؛ ۳۷۶/۹۸۶-۴۶۵/۱۰۷۲)، صاحب لطائف الاشارات، ۲- امام مہائمی (علاء الدین علی بن احمد؛ ۷۷۶/۱۳۷۲-۸۳۵/۱۴۳۱): تبصیر الرحمٰن وتیسیر المنان، ۳- امام بقاعی (ابوالحسن ابراہیم بن عمر؛ ۸۰۹/۱۴۰۶-۸۸۵/۱۴۸۰) نظم الدرر فی تناسب الآیات والسور۔

ان تینوں اکابر مفسرین نے آیت بسملہ کی تفسیر وتشریح ایک سو تیرہ مقامات پر کی ہے، اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ بسملہ کی ہر سورہ سے قبل تفسیر اس سورہ کے نظم ومعنی کے مطابق کی گئی ہے، اس پر خاکسار راقم بہت پہلے ایک طویل تحقیقی مضمون بلکہ کتاب - بسم اللہ الرحمٰن الرحیم - حمد اولین کے عنوان سے شائع کر چکا ہے۔ (ملاحظہ ہو: نقوش، قرآن نمبر جلد دوم، لاہور ۱۹۹۸، ۲/۴۵-۱۴۶) عہد جدید کے دو ماہرین نظم قرآنی عبدالحمید فراہی اور امین احسن اصلاحی نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ ''ہمارے نزدیک بسم اللہ سورۂ فاتحہ کی ایک آیت اور ہر سورہ کا فاتحہ ہے''، تاہم دونوں نے اس کی واحد تفسیر وتشریح صرف سورہ فاتحہ سے قبل کی ہے جو خالصتاً متقدمین سے ماخوذ ومستعار ہے، نظم قرآن کے اعتبار سے وہ اس کی ہر سورہ کے ساتھ تفسیر کرنے سے قاصر رہے باوجود اس کے کہ ہر سورہ کا فاتحہ مانتے ہیں۔

صحابہ کرام کی تصریح تعداد: گذشتہ مباحث بالخصوص آیت بسملہ کی قرآن مجید میں ایک سو تیرہ جگہ کتابت صحابہ وغیرہ سے یہ معلوم ہو چکا ہے کہ وہ بسملہ کی اتنی ہی تعداد مانتے تھے اور صرف ایک آیت مستقلہ کے مزید ایک سو بارہ مقامات پر دہرانے کے قائل نہیں تھے، اس پر مستزاد ان میں سے بعض جلیل ترین اور عظیم ترین مفسرین قرآن کا واضح بیان بھی ہے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ

کو ترجمان القرآن کے عظیم ومعنی خیز لقب سے متصف کیا جاتا ہے کیوں کہ رسول اکرمؐ نے ان کے قرآن کریم کی خصوصی فہم کی دعا فرمائی تھی جو جناب الٰہی میں مستجاب ہوئی، ان ہی ترجمان القرآن کا ایک بیان نقل ہوا ہے۔

امام زمخشری نے اپنی تفسیر کشاف میں بسملہ کے مختلف مسائل سے متعلق بحث میں لکھا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ فرماتے تھے کہ جس شخص نے بسملہ کو ترک کر دیا اس نے قرآن کریم کی ایک سو چودہ آیات ترک کر دیں، اس میں ایک سو چودہ کی تعداد کا بیان زمخشری کا تسامح ہے، اصل تعداد ایک سو تیرہ ہے، کشاف کے مرتبین ومحققین نے اپنے حاشیہ میں امام زمخشری کی اس خطا کا ذکر کر کے ایک سو تیرہ کی تعداد مختلف روایات واحادیث سے ثابت کی ہے، دوسرے اماماں تفسیر جیسے رازی وغیرہ کے ہاں بھی اس کا ذکر مل جاتا ہے، (زمخشری، محمود بن عمر، م ۵۳۸)، الکشاف عن حقائق غوامض التنزیل وعیون الاقاویل فی وجوه التاویل (تفسیر کشاف)، مرتبہ مصطفیٰ حسین احمد، مطبعۃ الاستقامۃ قاہرہ، ۱۹۵۳ء، ۱/۱، حاشیہ ۱:- وما بعد؛ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم - حمد اولین، ۲/۴۵ وما بعد اور اس کے حواشی)

کل آیات قرآن کی تعداد اور بسملہ: قرآن مجید کی تمام سورتوں کی کل آیات کریمہ کے بارے میں اماماں تفسیر وتشریح کا اختلاف پایا جاتا ہے، اس پر کامل بحث ایک الگ تحقیقی مطالعہ کا تقاضا ہے، جس کا سر دست موقع نہیں، یہاں صرف ایک مثال دی جاتی ہے، مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے لکھا کہ ''قرآن مجید کی کل آیتیں شمار کر لی گئی ہیں اور ان کی میزان بہ قول اصح ۶۶۱۶ ہے (اتقان)''، مولانا دریابادیؒ کا فقرہ ''بہ قول اصح'' اس اختلاف حساب کی طرف اشارہ ہی نہیں ثبوت پیش کر رہا ہے، دوسری طرف سعودی عرب کے سرکاری چاپ خانے ''مجمع الملک فہد لطباعۃ المصحف الشریف ۱۴۱۷ھ نے حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے مسخ کردہ ترجمۂ فارسی میں یہ تصریح کی ہے کہ کوفی علما کے طریقہ کے مطابق جو امام ابوعبدالرحمان عبداللہ بن حبیب سُلمی کے واسطہ سے حضرت علی بن ابی طالبؓ سے منقول ہے، قرآن مجید کی آیات کی تعداد ۶۲۳۶ ہے، بہ صراحت مصحف مذکورہ بالا کے اواخر میں ''روایة هذا المصحف'' کی سرخی کے تحت مختلف مسائل پر بحث میں کی گئی ہے''...... واتبعت فی عدد آیاته طریقة الکوفیین عن ابی

عبد الرحمان عبد الله بن حبيب السلمي عن علي بن ابي طالبؓ وعدد آي القرآن على طريقهم "٦٢٣٦" "آية" (ص ر ب؛ نیز تفسیر ماجدی، ۱/ ۳۳)

بہرحال یہ تعداد مجموعی ہو یا وہ، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بسملہ کی ایک سو تیرہ آیات کریمہ اس مجموعی تعداد میں شامل ہیں یا نہیں، علماو مفسرین اور شارحین کے عام طریقے اور روایتی مسلک سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ صرف ایک عدد کو شامل کرتے ہیں یا وہ بھی نہیں، اس بوالعجبی کی مثال مذکورہ بالا سعودی مصحف کے مرتبین کرام کے طریقے میں ملتی ہے اور دوسروں کے ہاں بھی، فارسی ترجمہ والے قرآن مجید میں اور بعض دوسرے سعودی مصاحف میں سورہ فاتحہ کی سات آیات میں بسملہ بھی شامل ہے، جب کہ دوسرے مصاحف و تفاسیر جیسے تفسیر ماجدی وغیرہ میں بسملہ کا کوئی عدد نہیں اور الحمد لله رب العالمين سورہ فاتحہ کی اولین آیت ہے اور غیر المغضوب عليهم ولا الضالين، ساتویں، اسی طرح ہر سورہ کے آغاز میں بسملہ لکھی ضرور جاتی ہے مگر اس کا عدد نہیں ہوتا۔

آیات قرآن شمار کرنے کا معمول: قرآن مجید کی مجموعی تعداد آیات کریمہ کو شمار کرنے کا معمول یہ ہے کہ وہ صرف سورتوں کی آیات کو گنتے ہیں، ہر سورہ کی آیات کا مجموعہ تیار کرتے ہیں اور اپنے حساب و خیال اور آیات کی تکمیل کے نظریہ سے اس کا کل مجموعہ ہر سورہ کے نام و مقام نزول وغیرہ کے ساتھ اس کی پیشانی پر ثبت کر دیتے ہیں جیسے سورہ فاتحہ کی سات آیات ہیں، سورہ بقرہ کی ۲۸۶ آیات ہیں، سورہ آل عمران کی دو سو آیات ہیں اور اسی طرح وہ تمام ایک سو چودہ سورتوں کی آیات الگ الگ گناتے ہیں، اختلاف نے اس باب میں بھی پیچھے رہنا گوارا نہیں کیا، لہذا بعض اوقات ایک ہی مفسر و شارح ایک ہی سورہ کی آیات کی تعداد دو دو دیتا ہے، مثلاً حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ جیسے عبقری مفسر و شارح قرآن کریم نے سورہ انعام کی تعداد آیات کے بارے میں لکھا ہے: "سورۂ انعام مکی است، و آں یک صد و شصت و پنج یا شش آیہ، بیست رکوع است" یعنی سورۂ انعام کی آیات کریمہ ۱۶۵ ہیں یا ۱۶۶، طرفہ ستم یہ کہ سعودی مجمع کے شائع کردہ اس نسخ ترجمہ شاہ کے متن قرآن مجید میں صرف ۱۶۵ آیات کریمہ کی حتمی تعداد ہے، حضرت شاہ نے دو اختلافی روایات قبول کر کے ان دونوں میں محاکمہ نہیں فرمایا اور دونوں کی تعداد بیان فرما دی، اس

کی توجیہ و تاویل کرنی مشکل ہے، سوائے اس کے کہ وہ فریق نہیں بننا چاہتے تھے، ایسی بعض اور مثالیں بھی دی جا سکتی ہیں، جیسے ان کے فرزند گرامی شاہ عبد القادر دہلوی کے اردو ترجمہ میں بھی اسی طرح انعام کے دو عدد ہیں۔

دراصل شمار کرنے والوں کے ذہن میں - کسی گوشۂ ذہن میں - یہ خیال پیوست ہے کہ قرآن مجید صرف سورتوں اور ان کی آیات کریمہ پر مشتمل ہے لہذا وہ صرف ان ہی کو گنتے ہیں، آیت بسملہ کا شمار نہیں کرتے کہ ان کے شعور میں یا لاشعور میں یہ خیال جاگزیں ہو گیا ہے کہ وہ آیت کریمہ ہونے کے باوجود شمار میں نہیں آتی اور اس خیال سے دو مزید خیال نکلے ہیں، ایک یہ اس کی تعداد صرف ایک ہے اور ایک سو تیرہ نہیں اور اسی کا شاخسانہ دوسرا یہ ہے کہ وہ قرآن مجید کے متن میں شامل ہی نہیں۔

موجودہ مصحف میں آیات قرآنی کی تعداد:

۱-فاتحہ-۷ ۲-البقرہ-۲۸۶ ۳-آل عمران-۲۰۰
۴-النساء-۱۷۶ ۵-المائدہ-۱۲۰ ۶-الانعام-۱۶۵
۷-اعراف-۲۰۶ ۸-انفال-۷۵ ۹-توبہ-۱۲۹
۱۰-یونس-۱۰۹ ۱۱-ہود-۱۲۳ ۱۲-یوسف-۱۱۱
۱۳-رعد-۴۳ ۱۴-ابراہیم-۵۲ ۱۵-حجر-۹۹
۱۶-نحل-۱۲۸ ۱۷-بنو اسرائیل-۱۱۱ ۱۸-کہف-۱۱۰
۱۹-مریم-۹۸ ۲۰-طہ-۱۳۵ ۲۱-انبیاء-۱۱۲
۲۲-حج-۷۸ ۲۳-مومنوں-۱۱۸ ۲۴-نور-۶۴
۲۵-فرقان-۷۷ ۲۶-شعرا-۲۲۷ ۲۷-نمل-۹۳
۲۸-قصص-۸۸ ۲۹-عنکبوت-۶۹ ۳۰-روم-۶۰
۳۱-لقمان-۳۴ ۳۲-سجدہ ۳۰ ۳۳-احزاب-۷۳
۳۴-سبا-۵۴ ۳۵-فاطر-۴۵ ۳۶-یٰس-۸۳
۳۷-صٰفٰت-۱۸۲ ۳۸-ص-۸۸ ۳۹-زمر-۷۵

۴۰-مومن-۸۵	۴۱-حم السجدہ-۵۴	۴۲-شوریٰ-۵۳
۴۳-زخرف-۸۹	۴۴-دخان-۵۹	۴۵-جاثیہ-۳۷
۴۶-احقاف-۳۵	۴۷-محمدؐ-۳۸	۴۸-فتح-۲۹
۴۹-حجرات-۱۸	۵۰-ق-۴۵	۵۱-ذٰریٰت-۶۰
۵۲-طور-۴۹	۵۳-نجم-۶۲	۵۴-قمر-۵۵
۵۵-رحمٰن-۷۸	۵۶-واقعہ-۹۶	۵۷-حدید-۲۹
۵۸-مجادلہ-۲۲	۵۹-حشر-۲۴	۶۰-ممتحنہ-۱۳
۶۱-صف-۱۴	۶۲-جمعہ-۱۱	۶۳-منفقون-۱۱
۶۴-تغابن-۱۸	۶۵-طلاق-۱۲	۶۶-تحریم-۱۲
۶۷-ملک-۳۰	۶۸-قلم-۵۲	۶۹-حاقہ-۵۲
۷۰-معارج-۴۴	۷۱-نوح-۲۸	۷۲-جن-۲۸
۷۳-مزمل-۲۰	۷۴-مدثر-۵۶	۷۵-قیامہ-۴۰
۷۶-دہر-۳۱	۷۷-مرسلات-۵۰	۷۸-نبا-۴۰
۷۹-نازعات-۴۶	۸۰-عبس-۴۲	۸۱-تکویر-۲۹
۸۲-انفطار-۱۹	۸۳-تطفیف-۳۶	۸۴-انشقاق-۲۵
۸۵-بروج-۲۲	۸۶-طارق-۱۷	۸۷-اعلیٰ-۱۹
۸۸-غاشیہ-۲۶	۸۹-فجر-۳۰	۹۰-بلد-۲۰
۹۱-شمس-۱۵	۹۲-لیل-۲۱	۹۳-ضحیٰ-۱۱
۹۴-انشراح-۸	۹۵-تین-۸	۹۶-علق-۱۹
۹۷-قدر-۵	۹۸-بینہ-۸	۹۹-زلزال-۸
۱۰۰-عادیٰت-۱۱	۱۰۱-قارعہ-۱۱	۱۰۲-تکاثر-۸
۱۰۳-عصر-۳	۱۰۴-ھمزہ-۹	۱۰۵-فیل-۵
۱۰۶-قریش-۴	۱۰۷-ماعون-۷	۱۰۸-کوثر-۳

۱۰۹-کافرون-۶	۱۱۰-نصر-۳	۱۱۱-لہب-۵
۱۱۲-اخلاص-۴	۱۱۳-فلق-۵	۱۱۴-ناس-۶

کل میزان = ۶۲۳۶

بسملہ کی آیات شامل نہیں: تمام متداول مصاحف میں خواہ وہ سکہ رائج الوقت سعودی طباعتیں ہوں یا دوسرے ممالک کی طباعتیں بالعموم تمام سورتوں کی آیات کریمہ کا مجموعی میزان ۶۲۳۶ ہی بتاتی ہیں جیسا کہ سعودی فارسی ترجمہ کے حوالے سے پہلے ذکر کیا جاچکا ہے، مولانا مودودیؒ جیسے سادہ لوح بزرگوں نے امام سیوطیؒ کی اتقان وغیرہ میں بیان کردہ تعداد پر بھروسہ کر کے ۶۶۱۶ کی تعداد لکھ دی اور اسے بہ قول اصح بھی قرار دیا، حالاں کہ وہ ریاضی کے حساب سے قطعی غلط ہے، روایات واقوال پر اعتبار کر کے اسی قسم کی غلطیاں ہوتی ہیں، ویسے ایک لحاظ سے وہ روایتی تعداد غلط بھی نہیں ہے، اس سے پہلے یہ ذکر آچکا ہے کہ قدیم ومتوسط ادوار میں مختلف علما نے مختلف شمار پر بھروسہ کر کے تعداد آیات بتائی ہے، اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ مختلف علما وقرائے کرام نے بعض بعض سورتوں کی آیات کی تعداد مختلف بتائی تھی، اس لیے تعداد آیات میں اختلاف نظر آیا اور قول اصح کے سہارے کی ضرورت بھی پڑی، اب چوں کہ تمام سورتوں کی آیات کی تعداد لوح سورت پر بھی ثبت ہے اور آیت بہ آیت ان کا شمار کر کے آخری آیت سورت کے اختتام پر بھی درج ہے، لہذا تعداد آیات میں غلطی یا کمی بیشی کا امکان ہی جاتا رہا، ۶۲۳۶ کی میزان قطعی اور حتمی تعداد آیات ہے۔

لیکن یہ واضح رہے کہ ۶۲۳۶ آیات کریمہ قرآن کریم کی ایک سو چودہ سورتوں کی ہی کل آیات ہیں، وہ قرآن کریم کی مجموعی آیات کریمہ کی تعداد نہیں ہے، کیوں کہ اس میں بسملہ کی ایک سو تیرہ آیات کو نہیں جوڑا گیا، اس عدد رتعداد کو جوڑنے کے بعد ہی کل آیات قرآنی کی تعداد بنتی ہے اور وہ ہے ۶۳۴۹ یعنی ۶۲۳۶ + ۱۱۳ = ۶۳۴۹ لیکن اس میزان مجموعی کا کوئی ذکر نہیں کرتا، کیوں کہ ان کے حاشیہ خیال میں بھی بسملہ کی ۱۱۳ آیات کریمہ کے جوڑنے کا خطرہ نہیں آتا تو کل میزان میں ان کا صحیح حساب کیوں کر لگایا جاتا؟

نماز میں قرأت بسملہ کا مسئلہ: نماز میں رسول اکرمؐ اور خلفائے اربعہؓ اور دوسرے صحابہ کرامؓ

سے بسملہ پڑھنے کا ثبوت ملتا ہے، اختلاف ہے تو صرف اس کے پڑھنے کی کیفیت میں ہے کہ اسے جہری پڑھا جائے یا سرّی اور یہ بھی صرف جہری نمازوں کا معاملہ ہے، سرّی نمازوں میں یہ اختلاف اٹھتا ہی نہیں، دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ سورۂ فاتحہ سے قبل پڑھا جائے، اس پر بھی اتفاق ہے، سورۂ فاتحہ کے بعد دوسری سورت ملانے سے قبل بھی پڑھا جائے، اس میں فقہی اختلاف کا پھر ذکر کیا جاتا ہے، اس اختلاف کی دو نوعیتیں ہیں، ان کے مختصر تجزیے سے مسئلہ کا حل اور اختلاف کا ازالہ ہوسکتا ہے۔

اول نوعیت ان اکابر فقہا و علما کے نزدیک پیدا ہوتی ہے جو بسملہ کو ہر سورہ کا حصہ بلکہ اولین آیت قرار دیتے ہیں، لہذا یہ لازمی ہے کہ اس فکر کے حاملین کرام امام شافعیؒ وغیرہ اس کا سرّی یا جہری جیسی بھی صورت ہو پڑھنا لازمی قرار دیتے ہیں اور ان کے اصول سے وہ صحیح ہے اور صرف سنت / مندوب ماننے کا نظریہ بھی صحیح ہے، اس کا ذکر ابھی آتا ہے، دوسری نوعیت سورۂ فاتحہ سے قبل سنت / مندوب ماننے والوں کے نزدیک ہے کہ وہ اس کی قرأت کو لازمی یا واجب نہیں مانتے لیکن سنت تو مانتے ہیں، لہذا عملاً دونوں میں صرف خیال کا فرق ہے، عمل کا نہیں۔

روایات حدیث و سنت سے ثابت ہو چکا ہے کہ رسول اکرمؐ قرآن کریم کی تمام سورتوں بالخصوص چھوٹی سورتوں کی تلاوت و قرأت بسملہ سے شروع کرتے تھے، لہذا سورہ فاتحہ کے بعد کسی بھی سورت سے قبل بسملہ پڑھنے میں کوئی قباحت نہیں بلکہ وہ سنت و ندب ہے اور اصولی طور سے بھی اس کو پڑھنا چاہیے کہ باعث برکت و ثواب ہے، حضرت امام مالکؒ کی طرف یہ خیال منسوب کیا گیا ہے کہ وہ بسملہ کے سرّی یا جہری کسی بھی حالت میں پڑھنے کے قائل نہ تھے، مگر اس قول کی نسبت مشکوک ہے، وہ ثنا کی طرح بسملہ کے پڑھنے میں بھی حرج نہیں سمجھتے بلکہ مستحسن قرار دیتے ہیں۔

نماز تراویح میں بسملہ کی قرأت: بالعموم تمام مسالک و ممالک میں صرف شافعیہ کا استثنا کر کے نماز تراویح میں بسملہ نہیں پڑھا جاتا، تبرک کے لیے قرائے کرام اور امام کسی کسی سورہ سے قبل کبھی کبھی اپنی صواب دید سے بسملہ بھی پڑھ دیتے ہیں، اس عمل جہالت سے زیادہ مرکب جہل کا نمونہ یا نمائندہ یہ رویہ و خیال ہے کہ بسملہ بالکل نہ پڑھنا چاہیے کیوں کہ ان اصحاب کے

نزدیک وہ قرآن کریم کا حصہ ہی نہیں، کچھ صاحبان فکر و نظر اسے قرآن کا حصہ تسلیم تو کرتے ہیں مگر فقہی مسلک کے جبر سے یا اپنی ترجیح بندہ سے بسملہ کی قرأت نہیں کرتے، حالاں کہ سمجھانے سے اصول مان لیتے ہیں۔

روزمرہ کی نمازوں کے برعکس نماز تراویح میں پورے ماہ رمضان المبارک کے اندر پورے قرآن کریم کی قرأت کرنے کو وہ دوسری سنت موکدہ قرار دیتے ہیں، پہلی سنت موکدہ پورے رمضان بھر نماز تراویح پڑھنے کی ہے، نماز تراویح میں پورا قرآن کریم ترتیب سے سورت بہ سورت پڑھا جاتا ہے لیکن ہر سورہ کے آغاز میں بسملہ نہیں پڑھا جاتا، ائمہ کرام اسے سرّی طور سے پڑھ لیتے ہیں جیسا کہ وہ فرماتے ہیں، اس عمل کے پیچھے دو افکار عالیہ کارفرمائی کرتے ہیں، ایک یہ کہ قرآن مجید سے مراد ان کی صرف سورتیں ہوتی ہیں اور دوم یہ کہ بسملہ سے قرأت کا آغاز اصول و حکم کے طور پر نہیں کرنا چاہیے، کیوں کہ رسول اکرمؐ اور خلفا و صحابہ کرام نماز میں قرأت قرآن کا آغاز الحمد للہ رب العالمین سے کرتے تھے، اس حکم کا اطلاق اور اپنی فہم قرآن کا اظہار وہ نماز تراویح کی مسلسل قرأت کے باب میں بھی کرتے ہیں، حالاں کہ یہ اطلاق و اظہار بالکل صحیح نہیں، جیسا کہ ابھی مختصراً اس پر بحث کی جاتی ہے۔

اصل مشکل وہاں پیدا ہوتی ہے جہاں سنت و تعامل صحابہ کرام کی واضح رہنمائی نہیں ملتی لیکن رسول اکرمؐ کی احادیث صحیحہ، تعامل صحابہ کرام کی روایات حسنہ اور ان سے بڑھ کر قرآن کریم کی آیات کریمہ کی ہدایت و رہنمائی میں قیاس صحیح کے دروازے کھلے ہیں اور اس سے قدم قدم پر کام لیا جاتا ہے، حتی کہ وہ بھی لیتے ہیں جو قیاس اصول تشریع اور اس کی کارفرمائی کے قولاً منکر ہیں، بسا اوقات ان کا قیاس اصحاب رائے کے قیاس سے بڑھ کر ہوتا ہے کہ وہ حدیث صحیح اور ثابت تعامل صحابہ کو بھی نظر انداز کر دیتا ہے جیسا کہ تراویح کی رکعتوں کا معاملہ ہے۔

بہر حال اس حکم اور اصول کو تسلیم کر لیا جائے کہ قرأت قرآن بالخصوص فاتحہ کی قرأت میں بسملہ کو جہر سے نہ پڑھا جائے تو اس کا اطلاق صرف فرض نمازوں پر ہوتا ہے یا زیادہ سے زیادہ روزمرہ کی نفل نمازوں پر، موخر الذکر کے بارے میں ابھی تک خاکسار راقم کو کوئی حدیث و سنت یا تعامل صحابہ نہیں مل سکا کہ وہ سند بن سکے، تمام روایات و احادیث اور تعامل صحابہ سے حتی

کہ فقہی امامان کرام کے اقوال عالیہ سے ثابت ہوتا ہے کہ اس حکم اور اصول کا اطلاق صرف اور صرف فرض نمازوں کی جہری قرأت پر ہوتا ہے، کسی اور نماز وصلوٰۃ پر نہیں۔

اس مقید، مخصوص یا مشروط حکم کو مطلق بنانے کی بے تدبیری عام طور سے مسلکی علمائے کی۔ نماز تراویح کی قرأت کا معاملہ مختلف ہے، لہٰذا جب اس میں پورے قرآن کریم کی قرأت بہ تمام وکمال سنت موکدہ ہے تو اس میں بسملہ کی قرأت بھی شامل و داخل ہے، سورہ فاتحہ سے قبل بھی اور ہر سورہ سے قبل بھی، ورنہ قرآن کریم کی ایک سو تیرہ آیات کریمہ کے ترک کے مجرم ہوں گے جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی ایک روایت وتبصرہ سے واضح ہوتا ہے، مزید یہ کہ ہر سال نماز تراویح میں پورا قرآن کریم نہ پڑھنے کے بھی مجرم ہوں گے۔

مختصر تجزیہ: اللہ تعالیٰ وتبارک کے نام نامی اور اسم گرامی سے ہر کام شروع کرنے کا حکم اللہ تعالیٰ ہی نے دیا ہے، لہٰذا ہر اچھے کام کرنے سے پہلے" بسم اللہ الرحمن الرحیم" پڑھنا چاہیے، فقہی موشگافی سے پرے وہ ضروری قرأت ہے، اسے صرف مسنون ومستحب قرار دینے سے فقہی خاطر کی تسکین تو ہوسکتی ہے مگر تسکین امر الٰہی اور تعمیل ارشاد نبوی نہیں ہوسکتی، پھر اللہ تعالیٰ کی ذات بے ہمتا اور اس کی حمدیت وبے نیازی کو کسی بندے کی تعریف وتحسین کی ضرورت نہیں، یہ حکم الٰہی اور ارشاد نبوی بھی تو بندے کے اپنے فائدہ ومفاد کے لیے ہے کہ اس نام الٰہی سے آغاز کرنے میں اس رحمٰن ورحیم کی رحمت بے کراں اور برکت بے پایاں سے بہرہ مندی ہوتی ہے، ظاہری طور پر بھی اور باطنی لحاظ سے بھی، اس کی حسی برکات کا فیضان بھی ہوتا ہے اور غیر محسوس برکات کا نزول بھی اور سب سے بڑھ کر قلب وروح کو طمانیت ملتی ہے کہ کسی مالک کل اور حاکم مطلق اور قادر توانا سے اس کا رشتہ ارتباط قائم ہوجاتا ہے جو اسے ہر آن اور ہر حال میں سہارا دیے رہتا ہے، اس کے جہان فکر ودانش میں اس کو بے یاری وبے مددگاری کی محرومی کا احساس نہیں ہونے دیتا۔

بسملہ- بسم اللہ الرحمن الرحیم -روایات کے مطابق اولین نازل ہونے والی آیت کریمہ ہے اور اگر صرف سورۂ اقرأ کی اولین آیت" اقرأ باسم ربک" کو ہی اولین تنزیل قرآنی ماننے پر اصرار کیا جائے تو بھی وہ اولین حکم ہے کہ اس آیت اولین میں بھی اپنے رب کے

نام پڑھنے کا حکم ہے اور رب رحمٰن ورحیم ہے، وہ اس میں معہود ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری کلام پاک -قرآن مجید- کی ہر سورہ سے قبل" بسم اللہ الرحمن الرحیم" کو اسی لیے نازل فرمایا ،،وہ نہ صرف حمد اولین ہے بلکہ حکم اولین بھی ہے، جب قرآن کریم جیسے کلام الٰہی کو پڑھنے سے قبل بسملہ پڑھنا ضروری کہا جو بہ تمام وکمال طاہر ومطہر اور بابرکات ومبرات ہے جو دوسرے تمام کلاموں، کاموں اور چیزوں سے قبل اس کا پڑھنا لازم ٹھہرتا ہے کہ وہ بہر حال انسانی اور بشری ہیں اور کلام الٰہی کی طہارت وپاکیزگی، رفعت وبلندی اور مرتبت وکمال سے ان کو کیا نسبت۔

اس عالم وکائنات رنگ وبو میں بعد از خدا اگر کوئی دوسری ذات بزرگ ہے اور کمال و جمال کی حامل ہے تو وہ رسول اکرمؐ کی ذات والا صفات ہے جو تمام انسانوں کے لیے خاتم النبیین ہونے کے سبب اسوۂ حسنہ کاملہ ہے، رسول اکرمؐ نے اپنے تمام کام بسملہ سے ہمیشہ آغاز فرمائے اور ان کے فوائد وبرکات سے بھی آگاہی بخشی، آپؐ کے جاں نثار ووفادار صحابہ کرام نے جو انسان اکمل واطہرؐ کے بعد خیر الناس ہیں، آپؐ کے اس اسوۂ عالیہ پر بھی ہمیشہ تعامل کیا اور امت مرحومہ کے لیے تعمیل ارشاد الٰہی ونبوی کی ایک عظیم وروح پرور نظیر قائم کی۔

قرآن مجید کی تمام سورتوں سے قبل تلاوت وقرأت میں رسول اکرمؐ اور صحابہ کرام بسملہ پڑھا کرتے تھے اور کتابت میں ہمیشہ اسے ہر سورہ سے قبل لکھا کرتے تھے، عہد نبوی میں جو قرآن کریم کے اجزا (صحف) مرتب ہوئے ان میں ہر سورہ سے قبل بسملہ رسول اکرمؐ کے حکم سے لکھی گئی تھی اور عہد صدیقی میں جب اولین صحف صدیقی مصحف کی شکل میں مرتب ہوئے تو اس میں بھی ہر سورہ سے قبل بسملہ ثبت تھی اور مصاحف عثمانی میں خلیفہ سوم نے اسے تمام سورتوں میں ثبت کروایا تھا، سوائے سورہ توبہ کے کہ اس سے قبل سنت سے اس کا اثبات نہیں ملتا۔

اجماع صحابہ کرام نے قرآن مجید کی ہر سورت سے پہلے، سوائے سورۂ توبہ کے، بسملہ لکھنے پڑھنے کا حکم جاری کیا، وہ ایسی اجتماعیت مسلمہ اور ایسے اجماع امت مرحومہ کی مثال ہے کہ اس کی نظیر صرف قرآن مجید کی سورتوں کی باہمی ترتیب اور ہر سورہ کی آیات کریمہ کی اندرونی ترتیب ہی میں ملتی ہے، یہی بنیادی طور سے بسملہ کی ایک سو تیرہ تعداد کی دلیل ہے، کیوں کہ صحابہ کرام نے اس پر بھی اتفاق کیا تھا کہ قرآن مصحف میں سوائے متن قرآن کے اور کچھ نہیں لکھا

جائے گا، حتی کہ آمین بھی نہیں لکھی، اگرچہ اس کا کہنا مسنون ہے مگر وہ نہ سورہ فاتحہ کا جزء ہے اور نہ قرآن مجید کے متن کا۔

فقہی اقوال ومسالک کا ایماندارانہ تجزیہ ثابت کرتا ہے کہ بسملہ قرآن مجید کا بہرحال ایک حصہ اور جزء ہے، ہر سورہ سے قبل اس کی تلاوت ضروری ہے، نماز میں اس قرأت کو خواہ واجب سمجھا جائے، خواہ سنت ومندب، ہر ایک اس کو پڑھنے کو کہتا ہے، سری اور جہری قرأت بسملہ کی تمام روایات واحادیث ملتی ہیں اور دونوں کا استناد مضبوط و پختہ ہے، لہذا ان کی قرأت کا اختیار جہر وسر بھی ہے کہ وہ اختلاف تنوع سے تعلق رکھتا ہے، ہر مسلک وموقف کے لوگ اپنے مسلک وفکر کے مطابق اس کی قرأت ضرور کریں مگر کبھی کبھی دوسری ثابت سنت پر عمل کرنے کی خاطر اس کی جہری قرأت بھی کیا کریں۔

ہر سورہ فاتحہ سے قبل بسملہ کی قرأت وتلاوت کا جو حکم ہے وہی ہر سورہ کریمہ کے آغاز کے لیے بھی ہے، سورۂ فاتحہ سے قبل جس طرح بسملہ کا اثبات قرأت وکتابت ملتا ہے اسی طرح ہر سورہ کریمہ سے قبل بھی ملتا ہے، شاید یہ کہنے کی جسارت کسی کو نہ ہو کہ سورہ سے قبل بسملہ کی قرأت درنماز سے کسی طرح بھی نماز میں خرابی آتی ہے، علما وفقہا کا ایک طبقہ اگر اس کو مستحسن طریقہ بتاتا ہے تو ان کا قول ومسلک بہرحال ایک ثابت سنت پر مبنی ہے، لہذا اس تنوع سخن سے نماز میں جمال وکمال بڑھتا ہے اور نام الٰہی کی دو دو بار برکت ہر نماز میں حاصل ہوتی ہے۔

نماز تراویح میں عام اور روزمرہ کی نمازوں کے مقابلے میں بسملہ کی ایک سو تیرہ بار جہری قرأت لازم تر ہو جاتی ہے، کیوں کہ وہ اس کی اتنی ہی تعداد میں آیات کریمہ ہیں، لہذا ان کی قرأت ترک کرنے سے پورے قرآن مجید کی قرأت پوری نہیں ہو سکتی، یہ خیال خام ہے کہ قرآن مجید صرف سورتوں اور ان کی آیات پر مشتمل ہے اور ان میں بسملہ شامل نہیں، اسی فکر کج کے سبب بسملہ کی آیات کریمہ کو قرآن کریم کی آیات کریمہ میں شمار نہیں کیا جاتا، ان کو شمار کرکے بتانا چاہیے کہ سورتوں کی کل آیات ۶۲۳۶ کے ساتھ بسملہ کی ۱۱۳ آیات بھی ہیں، اس طرح قرآن کریم کی کل آیات کا میزان ۶۳۴۹ ہے۔

تبیین الکلام فی تفسیر التوراۃ والانجیل علی ملۃ الاسلام - ایک مطالعہ

پروفیسر مسعود الحسن صاحب*

سید احمد خاں کے متنوع اور وقیع سرمایہ ادب کا دل کھول کر اعتراف ہوا ہے، ان کے مکتوبات اور مقالات کے ایک سے زائد مجموعے شائع ہو چکے ہیں، چنانچہ ان کی فکر اور علمی کاموں پر تحسین، تحقیق اور تنقید کا ایک معتد بہ ذخیرہ جمع ہو گیا ہے اور اس میں اضافہ ہنوز جاری ہے مگر محققوں اور ناشروں کی اس عمومی قدردانی کے باوجود ان کی مذہبی تصنیفات ابھی بدگمانی کے کہرے سے باہر نہیں آسکی ہیں، ایم-اے-او کالج کی مجوزہ صد سالہ تقریبات کے موقع پر ان کی جملہ تصانیف کی اشاعت نو کا بھی پروگرام تھا لیکن یونی ورسٹی کے سرکار بریدہ اقلیتی کردار کی بحالی کی جوش آفریدہ تحریک اور نوجوانوں کی بال ہٹ نے سارے منصوبوں پر پانی پھیر دیا، چند سال بعد سید ہاشم علی صاحب مرحوم سابق وائس چانسلر نے ان تصنیفات کی اشاعت کی غیر رسمی بات چھیڑی تو مدبران عافیت کوش آڑے آگئے، بات پھر آئی گئی ہوگئی، البتہ ایک ہزار کلومیٹر دور پٹنہ میں خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری کے فعال ڈائریکٹر، علمی ورثہ کے اچوک پارکھ اور ان کی تھک پرچارک، ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے سید صاحب کی وفات صدی کے بہانے ان کی تفسیر القرآن دو جلدوں میں شائع کردی، خدا کا شکر ہے کہ کوئی ہلچل نہیں مچی، بلکہ بعض اسکالرز نے اس کو دزدیدہ سراہا اور کچھ لکھا بھی، مسلم یونی ورسٹی کی سرسید اکیڈمی کے نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو سابق ڈائریکٹر اور سرسید کے شیدائی پروفیسر اصغر عباس نے کار اشاعت کو آگے بڑھایا، مکتوبات ولکچرز کے انتخابات اور ترجموں کی جھڑی لگادی، سید عالی مقام کی سہ لسانی سوانح، تاریخ فیروز شاہی، بائبل کا ترجمہ اور تفسیر

---

* سابق صدر، شعبہ انگریزی، مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ۔

بھی شائع کردی، حیات جاوید کا مکمل انگریزی ترجمہ بھی تیار کرالیا۔

ابتدا ہی سے ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان میں تجارتی مفادات کے ساتھ ساتھ اشاعت دین کی بھی ساعی رہی ہے، چنانچہ اس کے ۱۶۹۸ء کی چارٹر میں مشنریوں کے واسطے خاص گنجائش رکھی گئی تھی، یہ پالیسی پلاسی کی جنگ کے بعد اور بھی نمایاں ہونے لگی، کمپنی کا ایک ڈائریکٹر چارلس گرانٹ جو بعد میں بورڈ آف ڈائریکٹرس کا صدر بھی ہوا، کی حمایت سے ۱۸۱۳ء اور ۱۸۳۴ء کے چارٹرس کے رو سے مشنریوں کا عمل دخل اس حد تک بڑھ گیا کہ وہ کمپنی کے افسران کے بنگلوں پر بھی تبلیغی جلسے کرنے لگے، جن میں کمپنی کے سپاہی اور کارندے موجود رہتے تھے (۱)، پادری ہندو دھرم اور اسلامی شریعت کی تضحیک اور تنقیص سے گریز نہیں کرتے تھے، نتیجتاً تقریری اور تحریری مناظروں کا چلن عام ہونے لگا، پادری فنڈرس کے جلسے اور مناظرے بہت مشہور ہوئے جن کی تفصیلات اس نے اپنی کتاب ''میزان الحق'' میں شائع کیں، مسلمانوں کی طرف سے اس کا جواب ''اظہار الحق'' نامی رسالہ میں حاجی رحمت اللہ دہلوی نے دیا، یہ مناظرے پبلک مقامات کے علاوہ اسکولوں میں بھی ہونے لگے، عیسائی مشنری قرآن، وحی، ذات رسولؐ اور غزوات پر اعتراض و طنز کرتے تھے اور مسلم ناقدین، عقیدہ تثلیث، بائبل میں تحریف اور بشری دست اندازی پر گرفت کرتے تھے، اکثر دلیلوں کی کمزوری کو فقرہ بازی کے زور سے پورا کیا جاتا تھا، صورت حال کی سنگینی کا اندازہ اس امر سے کیا جاسکتا ہے کہ ایک محتاط اندازے کے مطابق ۱۲۵۹ھ اور ۱۳۰۰ھ کے چالیس اکتالیس سال کے عرصہ میں مناظرہ کی ۸۷ کتابیں شائع ہوئیں (۲)، جو اس زمانہ کے طباعتی پس منظر میں ایک غیر معمولی تعداد ہے۔

مسیحی تبلیغ کے جارحانہ انداز اور کمپنی کی کھلی سرپرستی کے نتیجہ میں ہندوستانیوں میں دل شکنی اور بیزاری کا پیدا ہونا لازمی تھا، ۱۸۵۷ء کے محشر خیز ہنگامہ سے پہلے ہی کچھ شورشیں ہوچکی تھیں، جن میں ویلور کا ۱۸۰۶ء کا واقعہ اور روہیل کھنڈ کے چھوٹے موٹے واقعات شامل ہیں، سرکاری بے انصافیوں کے علاوہ ان کے پیچھے مسیحی تبلیغ کے خلاف ردعمل بھی کارفرما تھا، سید احمد خاں نے اپنی معرکۃ الآرا اور بے لاگ تصنیف ''اسباب بغاوت ہند'' میں سیاسی اور سماجی عوامل کے علاوہ اس تبلیغی مضرت رسانی پر بھی دوٹوک روشنی ڈالی ہے، ان کے نزدیک مناظروں کی تلخ

اور ادھ کچری نکتہ چینیاں صدیوں پرانی غلط فہمیوں اور عداوتوں کو بڑھاوا ہی دے سکتی تھیں، وہ نہ تو باہمی کی منافرتوں کا مداوا بن سکتی تھیں، نہ راہ مستقیم کی مشعل، البتہ اگر براہیمی مذاہب کی یک جدی اور الہامی حقیقت کو افہام و تفہیم کے ذریعہ اجاگر کیا جائے اور غلط یا بے بنیاد تعبیروں سے بچا جائے تو مذہبی منافرت پر روک لگانا ناممکن نہیں تھا، ۱۸۵۷ء کی شورش عظمیٰ کے بعد بیرونی حکومت کی جانب سے مسلمانوں میں فتنہ بینی کی روش کی اصلاح بھی ضروری تھی، تاریخی کدورتوں اور موجودہ رنجشوں کا مداوا سہل الحصول نہ سہی، مگر فریضہ تدبیر ضرور تھا، سید صاحب کی فہم جو اور عہد ساز شخصیت نے اس مشن کو اپنالیا، اس کی تکمیل کے واسطے انہوں نے ان تینوں مذاہب کے پیام، صحیفوں اور بصیرتوں کو عام کرنے کا بیڑا اٹھایا، قرآن اور بائبل کی (نامکمل) تفسیریں اور خطبات احمدیہ اس سلسلہ کی اہم کڑیاں ہیں، جن کی افادیت آج بھی تابندہ ہے۔

زیر مطالعہ تصنیف تین حصوں پر مشتمل ہے، حصہ اول بارہ مفصل اور بنیادی مقالات پر مشتمل ہے، ہر مقدمہ میں ایک اہم اساسی عنوان سے بحث کی گئی ہے، دراصل یہ مقدمات ہی تبیین الکلام کی جان ہیں، انبیا کی بعثت کی ضرورت، وجود الٰہی کا اثبات، ہدایت انسانی کے واسطے کلام الٰہی کی اہمیت پر ابتدائی مقدمات میں بحث کی گئی ہے۔

وحی کیا ہے؟ اس کے نزول کے طریقے نیز وحی اور الہام میں امتیاز بھی زیر بحث آئے ہیں، وحی انبیا کے لیے مخصوص ہے مگر الہام دوسرے بزرگوں پر بھی نازل ہوتا ہے، مثلاً حضرت عیسیٰ کے حواری صاحب الہام تھے، چنانچہ ان کی تدوین کردہ اناجیل وحی تو نہیں، مگر الہامی کہلانے کی مستحق ہیں لیکن حواریوں کے رسائل (Epistles) بدیہی طور پر ان کے ذاتی مضامین اور تعلیقات ہیں، سید صاحب نے اپنے بیان کی تائید میں قرآنی آیات، مشکوٰۃ کی روایات اور چند معتبر جدید مسیحی علما مثلاً Horne اور Watson کے حوالے بھی پیش کیے ہیں، تیسرا مقدمہ صحف اولیٰ کے متعلق ہے جو قرآن میں مذکور ہیں مگر عام مسلمانوں کے نزدیک یہ تحریف سے بے داغ نہیں ہیں، اس ضمن میں تحریف کے مفہوم، اقسام اور اسباب سے مفصل بحث کی گئی ہے، شعوری اور بدنیتی پر مبنی تحریف تو عام نہیں لیکن مخطوطوں کی نقل و اشاعت کے دوران سہو یا غلط قرأت الفاظ کا غالب امکان رہتا ہے، امام بخاری اور عظیم مسیحی مجدد مارٹن لوتھر کی رائے بھی یہی ہے، چنانچہ سید صاحب

حضرت عیسیٰ کے حوارین کو "نہایت مقدس اور پاک دور صاحب الہام سمجھتے ہیں اور ان کے کلام کو سچ اور واجب العمل جانتے ہیں مگر انجیل میں داخل نہیں کرتے" کیوں کہ اصل انجیل وہی ہے جو حضرت عیسیٰ پر اتری (ص ۳۰) (۳)، چوتھے مقدمہ میں اس مضمون پر مزید بحث کی گئی ہے اور توریت، زبور وانجیل کے آسمانی کتب مقدسہ ہونے کے ثبوت میں مع چند آیات قرآنی کے ایک درجن سے زیادہ اسناد پیش کی گئی ہیں، بعض اہم عیسائی علما کی تحقیق کا بھی حوالہ ہے، جن کے نزدیک ان کتب مقدسہ میں تحریف اور تعلیقی مواد ثابت ہے، چنانچہ ایسی مشتبہ کتابوں کو مستند مروجہ بائبل کے نسخوں میں علاحدہ سے Apocrypha کے عنوان سے شامل کیا جاتا ہے، مسیحی علما نے مستند کتب بائبل کی تعداد ۳۹ گم شدہ کی ۱۶ اور خارج شدہ کی ۵۱ تسلیم کی ہے، سید صاحب نے ان کتب کے نام صفحات ۴۰ تا ۴۹ پر نقل کیے ہیں۔

چھٹا مقدمہ خاص طور سے اسلامی مفہوم تحریف کے متعلق ہے، جو تین بنیادوں پر منحصر ہے، ۱- تبدیلی شعوری ہو، ۲- کسی خاص نیت سے کی گئی ہو یا ۳- متن کو اصل مطلب سے اس طرف پھیر دیا گیا ہو، مقصود نہ تھا (ص ۶۴)، ان شرائط کے لحاظ سے تحریف کی آٹھ قسمیں ہو سکتی ہیں، چار لفظی اور چار معنوی، ان کا تجزیہ باعث طوالت ہوگا، مگر سید صاحب کے اخذ کردہ "نتائج" قابل ذکر ہیں، اول یہ کہ علمائے اسلام و مسیحیت کے درمیان بنیادی مفہوم میں کوئی خاص اختلاف نہیں ہے (ص ۶۱)، دوم یہ کہ بائبل کی مبینہ تحریفات زیادہ تر بعثت محمدی کی بشارت سے متعلق ہیں (ص ۶۶)، بائبل بالخصوص عہد نامہ جدید (NT) میں قرأت کی تحریف اور معنوی تحریف کی جن علما نے نشان دہی کی ہے، ان میں امام بخاری، امام فخر الدین رازی، ابن تیمیہ اور شاہ ولی اللہ خاص طور سے لائق ذکر ہیں، قرآنی آیات میں بھی اخفائے بشارت خاتم المرسلین کا حوالہ موجود ہے، ایسی کچھ تحریفوں کا اعتراف بعض مسیحی مورخین اور عالموں نے بھی کیا ہے، مثلاً Moshein نے اپنی تاریخ کلیسا میں مانا ہے کہ ناسٹک فرقہ والوں نے بعض تحریفات رائج کی تھیں اور اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جو عیسائی اپنے مذہب کے پابند تھے، وہ اس خطا سے بالکل آزادانہ تھے (ص ۹۳)، ولیم میور بھی مانتے ہیں کہ دوسری صدی میں فیلسوف اور حکیموں کے ساتھ بحث میں ان کا ہی طریقہ اختیار کیا گیا اور Origen وغیرہ کے زیر اثر یہ طریقہ اختیار ہوا، سید احمد بحث کا

خلاصہ اس طرح کرتے ہیں:

"غرض کہ اس بات میں ہم اور عیسائی دونوں متفق ہیں کہ یہودی اور عیسائیوں میں یہ رواج ہو گیا تھا کہ اپنی طرف سے کوئی کتاب یا عبارت لکھ کر اگلے بزرگوں یا نبیوں کے نام سے مشہور کر دیتے تھے اور اسی بات کا ذکر قرآن مجید میں ہے"۔ (ص ۹۵)

مسلمانوں میں یہ شبہ عام تھا کہ بائبل کی موجودہ کتابیں ان اصلی نسخوں کے مطابق نہیں ہیں، جن کو الہامی لکھنے والوں نے لکھا تھا، اس مسئلہ پر سید صاحب نے آٹھویں مقدمہ میں سیر حاصل گفتگو کی ہے، کچھ احادیث نقل کرنے کے علاوہ انہوں نے Horne کی شہرہ آفاق کتاب An Introduction to the Critical Study of the Scriptures (1825) کا حوالہ بھی دیا ہے، جس سے اس بدگمانی کی تصدیق ہوتی ہے، ایک دوسرے محقق Dr. Kenicott کی رائے بھی یہی ہے کہ بائبل کے تمام قلمی نسخے جو سات آٹھ سو سال پہلے لکھے گئے تھے، ان میں سے بعض نسخوں کو یہودیوں کی Senate کے احکام کے بموجب خارج کر دیا گیا تھا، کیوں کہ ان کی صحت پر شدید اختلاف رائے تھا، اس کی ایک دوسرے عیسائی محقق اور عالم Biohop Walker نے بھی تصدیق کی ہے (ص ۱۰۹-۱۱۰)، یہاں یہ امر بھی لائق ذکر ہے کہ ابتداءً بائبل آرامی یا عبرانی زبان میں لکھی گئی تھی اور ایسے یونانی نسخے جن میں عہد نامہ عتیق (OT) و عہد نامہ جدید (NT) دونوں کی کتابیں موجود ہوں، کم یاب ہیں اور ان میں بھی صرف چار انجیلیں پائی جاتی ہیں اور بعض نسخوں میں تو صرف اعمال (Acts) اور حواریوں کے نامہ جات ملتے ہیں انجیلیں نہیں، اسی طرح Apocriypse نامی کتاب یعنی رویائے سینٹ یوحنا (John) کا متن صرف چند ہی نسخوں میں ملتا ہے باقی میں نہیں، چنانچہ خود مسیحی علما کے نزدیک کوئی معتبر اور متفق علیہ متن موجود نہیں ہے، مسلکی اختلافات نے متن کی قطعیت کو مزید مجروح کر دیا ہے، رومن کیتھولک مسلک والوں کی رائے ان سب سے جدا ہے، بلکہ ان کے ایک عالم Professor Hug نے تو ترتیب کتب دوسرے تمام نسخوں سے الگ تجویز کی ہے اور خیال ظاہر کیا ہے کہ عہد نامہ جدید (NT) کا متن تین اقساط اور ادوار میں مرتب ہوا ہے، اس ساری بحث سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ عہد نامہ جدید کے موجودہ

نسخوں میں سے کوئی متن بھی چوتھی صدی عیسوی سے پہلے کا نہیں پایا جاتا (ص ۱۲۶)، سید صاحب نے متون کے اختلافات کا اجمالی جائزہ بھی پیش کیا ہے، ان کے نزدیک نسخوں کی کتابت میں اغلاط لفظی و معنوی کا احتمال بہت زیادہ ہے، حالاں کہ مسلکی اسباب اور محرکات کی کارفرمائی سے انکار ممکن نہیں، پرانی مثالوں کے علاوہ خود انیسویں صدی سے اس کی ایک مثال پیش کی ہے، Dr.Macey نے اپنے ذاتی قیاسات اور عقائد کو عہد نامہ دید کے یونانی اور انگریزی ترجموں میں شامل کردیا ہے، اس طرح کی مثالوں سے یہ شبہ تقویت پاتا ہے کہ ممکن ہے کہ کتاب ہائے مقدس میں ایسے امور داخل ہوگئے ہوں جو اولین الہامی مصنفین کے مافی الضمیر سے مطابقت نہ رکھتے ہوں اور یہ خود عیسائی بھی مانتے ہیں، سید صاحب اس قسم کی بے نتیجہ اور غیر ضروری حد تک افتراق انگیز بحث کو طول دینے کے قائل نہیں، صلح جوئی اور رواداری ان کا وصف ہے، چنانچہ وہ بحث کو اس طرح سمیٹتے ہیں:

> "میری رائے یہ ہے کہ جب ہم خود الٰہی کتب موجودہ میں عقاید ایمانیہ کو حضرت یونس سے لے کر خاتم النبیین صلوٰۃ اللہ اجمعین تک متحد پاتے ہیں تو ہم کو اس فضولی بحث اور تکرار میں پڑنے سے کیا فائدہ ہے"۔ (ص ۱۵۵)

سرسید نے نویں مقدمہ میں بائبل کے ترجموں کی تاریخ پر تحقیق کی ہے، ان کا قیاس ہے کہ یہ اولاً عبرانی زبان میں لکھی گئی، جس کی سند وہ بخاری کی اس روایت سے لیتے ہیں کہ آنحضرتؐ کے زمانہ میں یہودی عبرانی توریت پڑھتے تھے، دوسری زبانوں میں ترجموں کی تفصیلات انہوں نے Horne سے مستعار لی ہیں اور عہد نامہ عتیق و جدید پر الگ الگ بحث کی ہے، یونانی ترجمہ عبرانی سے ہوا اور Septuagint کہلایا، قدیم لاطینی ترجمہ Valgate کہلایا اور عیسائیوں کی Council of Trent نے اس کو کلیسا کا مستند اور سرکاری ترجمہ قرار دیا، اس میں اور چند صدی بعد کیے گئے پروٹسٹنٹ ترجموں میں خاصے اختلافات ملتے ہیں، چرچ آف انگلینڈ کا پہلا مصدقہ ترجمہ ۱۶۰۳ء میں مکمل ہوا اور Authorised Version کے نام سے جانا گیا، عہد نامہ جدید کا پہلا عربی ترجمہ غالباً ۱۳۴۲ء میں ہوا اور ۱۶۱۶ء میں طبع ہوا، یوروپی، افریقی اور ایشیائی زبانوں بشمول ہندوستانی زبانوں کے ترجموں کی تاریخ بھی دی گئی ہے، سرسید کے ذاتی کتب خانہ میں بائبل

کے ۲۰ نسخوں کا پتہ چلتا ہے، ان کی تفصیل اس طرح ہے، بائبل -۱- نسخہ، انگریزی کا مصدقہ متن کا نسخہ ۱- عدد، عربی ترجمہ مطبوعہ ۱۸۱۱ء ۱- عدد، عربی میں زبور کا قلمی نسخہ ۱، اردو کے مطبوعہ تراجم ۷ عدد، فارسی مطبوعہ نسخے ۷ عدد، اس تفصیل سے بائبل میں ان کی عالمانہ دلچسپی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، انگریزی میں ثانوی کتب ان کے علاوہ ہیں جن کے حوالے مقدمات اور تفسیر خاص میں جابجا ملتے ہیں۔

اس باب میں سید صاحب نے مسلمانوں کے متعلق عیسائیوں کی بعض بدگمانیوں کا بھی جائزہ لیا ہے، عیسائیوں کو ایک عام بدگمانی یہ تھی کہ نزول قرآن سے مسلمان بائبل کی عمومی تنسیخ اور تردید مراد لیتے ہیں اور اس کے وجود کو تسلیم نہیں کرتے، جب کہ قرآن میں صاف صاف صحف اولیٰ، زبور اور انجیل کا ذکر موجود ہے، اس کے ساتھ ہی عیسائی عالم بعض قرآنی آیات میں تضاد کی بھی نشان دہی کرنے کی کوشش کرتے ہیں، سرسید نے ان غلط فہمیوں کے ازالہ کے واسطے مسلمانوں کے تصور نسخ پر مدلل بحث کی ہے، جو بعض جزئیات میں اکابرین کی رائے سے اختلاف بھی کیا ہے، چنانچہ وہ تنسیخ احکام کی قطعیت اور تقوی و مفہوم سے اتفاق نہیں کرتے، ان کے نزدیک تنسیخ کا اعتراف قرآن کے تبدیلی سے مبرا ہونے کے عقیدہ کے خلاف ہے، ان کا کہنا ہے کہ بعض امور مخصوص حالات میں نافذ العمل ہوتے ہیں اور جب حالات بدل جاتے ہیں تو وہ منسوخ نہیں ہوتے، بلکہ ان کی مدت نفاذ مکمل ہوجاتی ہے، جیسے کہ مریض کی کیفیت کے مطابق پرہیز اور دواؤں کی تفصیلات بدلتی رہتی ہیں، یہ پرانی ہدایات کی تکذیب، تنسیخ یا سود مندی کی منکر نہیں ہوتیں، اس کی مثال وہ حضرت عیسیٰ کے اس ارشاد سے دیتے ہیں کہ حضرت موسیٰ نے فروسیوں (Pharisees) کو طلاق زوجہ کی اجازت دی تھی مگر جب حالات میں رحمت و شفقت پیدا ہوئی تو طلاق کے حق کو متروک کردیا گیا (ص ۲۶۷)، اس کا یہ مطلب نہیں کہ پہلی اجازت غلط تھی۔

ان مفصل مقالات کے بعد جلد اول میں دو نہایت معلومات افزا اور تاریخی اہمیت کے حامل تتمے (ضمیمے) ۹۹ صفحات پر محیط شامل ہیں، پہلے تتمہ میں عبرانی، یونانی اور شامی نسخوں کی عہد بہ عہد کی فہرست نقشہ کی شکل میں دی گئی ہے اور وہ تمام تاریخی واقعات جن کا بائبل میں ذکر ہے

ابتدائے آفرینش سے ۱۰۰ء تک شامل ہیں، عیسوی اور ہجری تاریخیں بھی دو متوازی کالم میں مندرج ہیں جو تاریخی تقابلی مطالعہ کرنے والوں کے واسطے نہایت مفید ہیں، تتمے بھی اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں دیے گئے ہیں، جس سے مسلمان اور عیسائی یکساں فائدہ اٹھا سکتے ہیں، حصہ اول کے سرورق پر سنہ طباعت ۱۸۶۲ء مطابق ۱۲۷۸ھ دیا گیا ہے، جب کہ جدول متذکرہ بالا میں آخری اندراج ۱۳۰۰ھ مطابق ۱۸۸۲ء ہے، جس سے کتاب پر نظر ثانی کا اشارہ ملتا ہے، مقام اشاعت غازی پور دیا ہے۔

حصہ دوم میں سال طباعت ۱۲۸۱ھ دیا گیا ہے اور مقام طباعت علی گڑھ ہے۔

حصہ سوم میں سرورق پر سال طباعت ندارد ہے، البتہ دیباچہ میں ۱۲۷۸ھ مطابق ۱۸۶۲ء مرقوم ہے، یہ معمولی اختلافی اندراجات غالباً بعض طباعتی دشواریوں کے باعث رونما ہوئے ہیں۔

تبیین الکلام کا دوسرا حصہ تورات کے پہلے جز یعنی کتاب پیدائش کے پہلے دس ابواب کے ترجمہ اور تفسیر پر مشتمل ہے، آیات بائبل کا متن عبرانی میں اور ترجمہ اردو اور انگریزی دو زبانوں میں دیا گیا ہے، توضیحی یا تائیدی قرآنی آیات اصل عربی میں پیش کی گئی ہیں، کتاب کا آغاز دو دیباچوں سے ہوتا ہے، پہلے میں تورات کی تاریخ اور مضامین پر بحث کی گئی ہے، لفظ بائبل کی وجہ تسمیہ، عہد نامہ عتیق کی تعریف، کتب موسوی اور دیگر کتب یعنی کل ۳۹ کے اسماء و فہرست اور قرآن کریم میں ان کا تذکرہ مع حوالہ جات سورہ و آیات مندرج ہیں، اس کے بعد یوروپی عیسائی مفسرین کے اہم نظریات متعلق تاریخ و واقعات مجملاً دیے گئے ہیں، دوسرا دیباچہ خاص کتاب پیدائش (Book of Genesis) پر ہے، تورات کے مصنف کے متعلق اس وقت کے معروف فاضلوں مثلاً Doyly & Mant کی آرا کا خلاصہ بھی پیش کیا گیا ہے جو مسلم علما کی تحقیق سے مختلف نہیں ہیں، بجز اس کے کہ مسلمان مورخ بخت نصر کے ہاتھوں القدس کی تاراجی کے بعد حضرت موسیٰ کی کتاب کا کوئی نسخہ باقی رہنا نہیں مانتے، بلکہ تورات کے موجودہ متن کو حضرت عذرا کی تصنیف مانتے ہیں، اس ضمن میں امام فخر الدین رازی اور کلبی کی روایات سے استناد کیا ہے مگر مسلمان بہر حال ان کتب کو مقدس اور لائق احترام تسلیم کرتے ہیں، محل تصنیف کے بارے میں علمائے یہود میں دو گروہ

ہیں، ایک کا خیال ہے کہ تورات موسیٰ نے اس وقت لکھی جب وہ بنی اسرائیل کو مصر سے نکال کر لائے تھے، دوسرے فریق کا ماننا ہے کہ یہ کتاب ان کے کوہ طور پر قیام کے دوران نازل ہوئی، جسے وہ طور سے واپسی پر ضبط تحریر میں لائے، مقام و زمانہ تحریر کے متعلق یہودیوں کے آپسی اختلافات کے باوجود مسلمان تورات کو الہامی مانتے ہیں، اسی طرح بعض علما کے نزدیک تورات ۲۳۶۹ سال کی مدت کا احاطہ کرتی ہے، جب کہ دوسرے یہ مدت ۳۶۱۹ برس قرار دیتے ہیں، یہودی علما بائبل میں مذکورہ واقعات کو تاریخی اور حقیقی سمجھتے ہیں، جب کہ کچھ عیسائی محققین ان کو صرف اساطیری حیثیت دیتے ہیں، باغ عدن سے خروج آدم Dr.Horne کے نزدیک ایک تاریخی واقعہ ہے اور مسلمان بھی اس رائے سے متفق ہیں، البتہ مسلمان کلام الٰہی کو تمثیل سے مکمل طور پر خالی نہیں مانتے مگر اس میں تاریخ بھی شامل ہے، ان دونوں صورتوں سے مکمل انکار خلاف عقل و تجربہ ہے۔

ترجمہ اور تفسیر آیت بہ آیت دی گئی ہے، حاشیہ میں عہد نامہ عتیق و جدید کی متعلقہ آیات (Verses) مع سلسلہ و شمار اور اکثر قرآنی آیات کے حوالہ جات ہیں اور ہر آیت کی تفسیر میں بعض ممتاز یہودی و عیسائی مفسروں کی رائے بھی دے دی گئی ہے، جس سے سید صاحب کی دقت نظر اور دقت معلومات کا اندازہ ہوتا ہے، مشرقی اور مغربی مراجع پر ان کی یکساں دسترس ان کے عصری پس منظر میں حیرت ناک ہے، پہلے باب میں کائنات، سیارگان، وقت، نباتات، بہائم اور انسان کی تخلیق کا بیان ہے، آیت ۲ پر ایک نوٹ میں سید صاحب نے تبصرہ کیا ہے کہ کتاب ہائے مقدس میں عالم شہود کی ابتدا اور ارواح و فرشتوں کے وجود کا ذکر تو ہے مگر ان کی تخلیق و وقت کا کوئی حوالہ نہیں ملتا، بائبل میں خدا کا علیم و خبیر ہونا مذکور ہے، مسلمان اس صفت کو لوح و قلم کے استعارہ سے تعبیر کرتے ہیں، اپنے نظریہ کے ثبوت میں مشکوٰۃ اور بخاری کی حدیثوں کو دہرایا ہے، جن میں لوح و قلم کو پیکر یا اشیا نہیں مانا گیا ہے، بلکہ سرسید کے الفاظ میں:

> "اللہ کی صفت اور ارادہ کو ان الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے، تا کہ لوگ محسوسات میں اس کی مثال سمجھ کر خدا کی عظمت اور اس کی بزرگی پر اقرار کریں"۔ (ص ۵۰)

وہ ان احادیث پر مفصل گفتگو کے بعد یہ نتیجہ بھی اخذ کرتے ہیں کہ:

"تمام عالم کا وجود ایک ہی چیز سے ہوا ہے، جس چیز سے کہ ہمارا وجود ہوا ہے، اسی چیز سے پتھر، درخت اور حیوانات کا بھی وجود ہوا ہے اور جو چیز ہم میں ہے، وہی چیز ان سب میں ہے، صرف ظہور کے طریقہ اور شکل میں فرق ہے"۔ (ص ۵۴)

اس کے ساتھ ہی وہ اس امکان کو بھی تسلیم کرتے ہیں کہ:

"ایک قسم کی صفت دوسرے موجودات سے مشابہ ہوتی جاتی ہے، مثلاً معدنیات نباتات سے اور نباتات دوسری قسم کی نباتات کے ذریعہ حیوانات سے اور بالآخر نہایت قریب قریب انسان کے ہو، ممکن ہے یہ تصور آج قابل قبول نہ ہو مگر علم کی روز افزوں ترقی سے بعید نہیں کہ وہ ہم کو ان سب باتوں پر یقین کرادے، اس سے یہ بھی امید بختی ہے کہ وہ ہم کو ان سب باتوں پر یقین کرادے گی اور جان لیا جاوے گا کہ جو بات ملہم شخصوں کے ہونٹوں سے لی گئی ہے وہ کیسی سچ تھی"۔ (ص ۵۵)

بہ ظاہر اس بیان سے بالواسطہ نظریہ ارتقا کی تائید ہوتی ہے مگر یہاں دو باتیں ضرور ملحوظ خاطر رہنی چاہئیں، اول یہ کہ انیسویں صدی میں ارتقائے حیات کے ماننے والے سائنس داں اس سلسلہ ارتقا میں جمادات اور نباتات کو شامل نہیں کرتے تھے، صرف حیوان سے انسان کے ارتقا کے موید تھے، دوسرے یہ کہ سرسید نے استنباط کتب الٰہی اور انبیائے اکرام کے ارشادات سے کیا ہے، ان سے بہت پہلے جلال الدین رومی (م ۱۲۷۳ء) منازل خلقت انسان کے متعلق کہہ چکے تھے۔

آمدہ اول باقلیم جماد   وز جمادی در نباتی اوفتاد

پہلے وہ (روح) جمادی (اقلیم میں) آئی اور جمادی (اقلیم) سے نباتی (اقلیم) میں آئی۔

سالہا اندر نباتی عمر کرد   وز جمادی یاد نا ورد بزد

سالوں نباتی (اقلیم) میں عمر بسر کی اور سرکشی کی وجہ سے اپنی جمادی (زندگی) کو بھلا دیا۔

وز نباتی چوں بحیوانی فتاد   نامدش حال نباتی ہیچ یاد

اور نباتی (اقلیم) جب حیوانی (اقلیم) میں آئی اس کو نباتی (اقلیم) کا حال کبھی یاد نہ آیا۔

سید صاحب نے یہودی اور عیسائی ترجموں کے درمیان اور خود بعض عیسائی ترجموں کے لفظی اختلافات کی بڑی باریکی سے نشان دہی کی ہے اور پوری احتیاط سے سب اہم قرأتیں (Variants) اپنی تفسیر میں شامل کر لی ہیں، اس مسئلہ پر شرح وبسط سے بحث کرنے کے بعد کہ کتاب مقدس میں تذکرہ آفرینش کا مقصد صرف عمرانی بیان نہیں ہے، بلکہ اس واسطے ہے کہ انسان جان لے کہ تمام چیزوں کا پیدا کرنے والا خدا ہے، تاکہ لوگوں کے دل میں خدا کی عظمت اور بزرگی کا احساس پیدا ہو اور وہ اس کی اطاعت پر سرگرم ہوں اور یہ بات جب ہی حاصل ہوتی ہے، جب کہا جاوے کہ پہلے ان چیزوں میں سے کوئی چیز نہ تھی (ص ۶۳ و ۶۴)، مجموعی طور پر سید احمد نے کتاب پیدائش کے بیشتر ارشادات سے اتفاق کیا ہے اور قرآنی آیات سے تطابق بھی کیا ہے، مگر ترجمہ کے ابہام اور مغالطے بھی ان کی نظر سے بچ نہیں پائے ہیں، مثلاً باب اول کی درس ۲۶ کا انگریزی مترجموں نے اس طرح ترجمہ کیا ہے "اور خدا نے کہا بنانے دو ہمیں آدمی"، جس سے خدا کی دوئی کا اشتباہ پیدا ہوتا ہے، جب کہ یہ متفقہ عقیدہ توحید کے خلاف ہے، ان کے نزدیک مستعملہ عبرانی الفاظ سے یہ مفہوم نہیں نکلتا، اسی طرح سے انہوں نے بائبل کے ایک اہم نظریہ سے یہ بحث کی ہے کہ اللہ نے انسان کو اپنی صورت (Image) میں بنایا لیکن وہ اس کو ترجمہ کی غلطی پر محمول کرتے ہیں اور تشریح کرتے ہیں کہ اللہ نے فرمایا کہ ہم بنادیں آدم کو اپنے سایہ سے مانند اپنی شکل کے، اس طرز کلام سے عیاں ہے کہ "اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ قامت یا اعضاء جسمانی میں انسان خدا کی صورت میں ہے، بلکہ یہ کہ انسان خدا کے سائے سے بنا ہے، یعنی جو صفات خدا میں ہیں، ان ہی کا پرچھانوا اس میں ہے، جیسے صفات علم، رحیمی، ایجاد اور عدالت وقدرت وغیرہ"۔ (ص ۹۲)

کتاب پیدائش کے دوسرے باب میں وضع خلقت، باغ عدن، نیک وبد میں امتیاز، اسمائے ذی حیات، پیدائش حوا اور یوم سبت کے قیام کا بیان ہے، یہاں بھی اپنے دستور کے مطابق سید صاحب قرآن اور بائبل میں مطابقت اور اختلافات کی نشان دہی کرتے ہیں، بالخصوص تفسیر کبیر اور بیضاوی کی تفسیر سورۂ بقرہ سے استناد کیا ہے، معتزلہ کا نظریہ کہ باغ عدن زمین پر (فلسطین) میں واقع تھا اور آزمائش آدم کے واسطے بنایا گیا تھا، یوم سبت کے سلسلہ میں دوسری بائبلوں کے مقابلہ میں یونانی بائبل کی روایت کو زیادہ قابل قبول مانا ہے، انسان کے مٹی سے

بنائے جانے اور اس میں روح پھونکنے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حالاں کہ انسان کے مادی وجود کو بقا نہیں مگر روح جو خدا سے نکلی ہے، وہ غیر فانی ہے، یہودی، عیسائی اور مسلمان جنت کے دو درختوں (زندگی اور شر) کو اصلی درخت سمجھتے ہیں مگر سرسید کے نزدیک حضرت موسیٰ نے درخت بہ طور استعارہ استعمال کیا ہے، ان کی دلیل ہے کہ اسی باب کی درس ۵ کے مطابق اس وقت تک نہ درخت اُگے تھے، نہ گھاس اُگی تھی اور نہ آدم تھا، بلکہ جو کچھ کارخانہ اشجار اور حیوان کا پہلے پیدا ہو چکا تھا، وہ سب برباد ہو گیا تھا، صرف آسمان، زمین رہ گئی تھی، جو خالی اور سنسان تھی۔ (ص ۱۲-۱۱۱)

مسیحی علما کے نزدیک آدم پر پابندی ان کی آزمائش کے واسطے تھی جس پر وہ پورے نہیں اترے اور گناہ کے مرتکب ہوئے، سرسید کہتے ہیں کہ پھل کھانا کوئی شرعی گناہ نہیں تھا، کیوں کہ اس وقت شریعت قائم ہی نہیں ہوئی تھی، دلیل میں وہ تفسیر کبیر کی سورہ بقرہ کی آیت ۳۵ کی تفسیر پیش کرتے ہیں، یہودی اور عیسائی فاضلوں کا عقیدہ ہے کہ حوّا میں روح نہیں تھی، سید صاحب کا جواب ہے کہ چوں کہ وہ جاندار چیز سے بنائی گئیں، اس واسطے روح کے ساتھ پیدا ہوئیں، جنسی مساوات کے حامیوں کے واسطے سید صاحب کی یہ رائے خصوصی دلچسپی کا باعث ہو سکتی ہے۔

تیسرے باب میں سانپ کا حوّا کو فریب دینا، آدم کی نافرمانی اور دونوں کی حضور قدس میں پیشی، عورت کی کوکھ سے ایک نجات دہندہ کی آمد کی بشارت، آدم و حوّا کا احساس بے لباسی و ندامت، جنت سے اخراج وغیرہ مذکور ہیں، ان کی تصدیق قرآن میں سورۂ اعراف سے بھی ہوتی ہے، تینوں مذاہب کے علما بالاتفاق سانپ سے شیطان مراد لیتے ہیں، البتہ اختلاف اس امر میں ہے کہ شیطان نے فریب کیوں کر کیا، یہودیوں اور عیسائیوں کے نزدیک اس کا یہ بہروپ آدم سے نافرمانی کرانے کے واسطے تھا، مسلمان بھی ایسا ہی مانتے ہیں مگر سرسید کی رائے جدا ہے، وہ شیطان کے جداگانہ وجود کے قائل نہیں ہیں، بلکہ اسے انسان کے خمیر میں شامل مانتے ہیں، جس کا دوسرا حصہ خیر ہے، اپنی تائید میں وہ بخاری، مسلم اور ترمذی سے چند احادیث پیش کرتے ہیں، عثمان بن ابی العاص نے ابن مسعود سے روایت کی ہے کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا کہ ابن آدم میں ایک حصہ شیطان کا ہے (ص ۱۴۹)، چنانچہ شیطان نفس حیوانی کا نام ہوا، مشہور صوفی شیخ محب اللہ الہ آبادی کا ایک قول بھی نقل کیا ہے کہ جو کچھ ہمیں اپنے رب کی طرف رغبت اور محبت سے روکتا

ہے اور احکام الٰہی سے دور کرتا ہے وہ ہمارا شیطان ہے، سید صاحب ایک لسانی دلیل بھی دیتے ہیں، عربی لغت میں لفظ شیطان کسی علاحدہ وجود کے بجائے منہ زور گھوڑے کے واسطے استعمال ہوتا ہے، سرسید اپنے اس نظریہ کے اشارے بائبل میں بھی پاتے ہیں، مثلاً انجیل مارک کے باب ۱۴ کی درس نمبر ۵ اور انجیل جان کے باب ۱۳ کی درس ۲۷ میں وہ آدم و حوّا کے گناہ کی پاداش میں پوری نسل انسانی کو پیدائشی طور پر معصیت زدہ ماننے کے واسطے بھی تیار نہیں کہ والدین کے عصیان کی اولاد کو سزا دینا، انصاف الٰہی کے وصف کی نفی کرتا ہے، انہوں نے یہ نکتہ بھی اٹھایا ہے کہ آدم نبی تھے، جو قرآنی اصول کے مطابق گناہ سے پاک ہوتا ہے، ان جزوی اختلافات کے باوجود وہ بائبل کو مقدس اور ہدایت کی کتاب مانتے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

"ہم مسلمان یقین کرتے ہیں کہ تمام ہوئی بائبل خدا کی وحدانیت حقیقی کی ہم کو ہدایت کرتی ہے اور الٰہیت میں کسی وجود کا شریک ہونا نہیں بتاتی"۔ (ص ۱۲۶)

اس بیان سے عیسائیوں کے دعویٰ تثلیث سے سید صاحب کی برأت ظاہر ہوتی ہے۔

آدم و حوّا کے دو بیٹوں ہابیل اور قابیل کی پیدائش، ان کے متضاد اعمال، خدا کے حضور ان کی قربانی اور حسد کے باعث بھائی کے ہاتھوں ہابیل کا قتل، دنیا میں پہلے شہر کی بنیاد اور نسل انسانی کی افزائش، کتاب چہارم کے مضامین ہیں، گویا کہ بائبل میں عمرانیات اور امور انسانی میں خیر و شر کا دخل، ان سب کو اجمالاً بیان کیا گیا ہے، دونوں بھائیوں کے متعلق رائے میں علمائے مسیحت و اسلام متفق ہیں، چنانچہ سرسید نے Bishop Conylear اور امام رازی کے بعض خیالات کی ہم آہنگی کی وضاحت بھی کی ہے، اگلے باب میں آدم سے لے کر نوح تک کی نسل کا شجرہ، ان کے حالات اور طویل عمروں کا تذکرہ ہے، یہاں بھی تینوں مذاہب کے علما عموماً متفق الخیال ہیں، ضمناً سرسید یونانی اور انگریزی ترجموں کے مابین کچھ اختلافات کا Scott کے حوالہ سے تذکرہ کرتے ہیں، وہ عیسائیوں کے اس خیال سے بھی متفق نہیں کہ ابتداءً آدم کو خدا کی صورت (Image) پر بنایا گیا اور ان کی نافرمانی کے بعد شکل تبدیل ہو گئی، وہ مسلمان عقیدہ کے مطابق عیسائیوں کے برعکس حضرت شیث (Seth) اور نوح (Enoch) کو نبی مانتے ہیں۔ (ص ۲۱۲)

باب ۶ تا باب ۱۰ میں حضرت نوح اور ان کی اولاد کا بیان ہے، ان ابواب میں سید صاحب

بائبل اور قرآن میں خاصی مطابقت پاتے ہیں، مگر حیوانوں پر نزول عذاب کو وہ تسلیم نہیں کرتے، اس لیے کہ جب ان کو خیر و شر کی تمیز ہی عطا نہیں ہوئی تو عقوبت کا نزول عدل الٰہی کے انکار کے مترادف ہوگا (ص ۲۳۲)، طوفان نوح کی بیشتر تفصیلات، اس کا نوح کی عمر کے ۶۰۰ویں سال میں واقع ہونا اور دیر تک قائم رہنا، بائبل کی ورس ۲۳ سے ثابت ہے مگر باب ۸ میں کشتی نوح کا کوہ ارارات پر ٹکنا، نوح کی قربانی اور وعدۂ خداوندی کہ زمین پر عام عذاب پھر نہیں بھیجا جائے گا، اس کے بیان میں سرسید نے عبرانی اور انگریزی ترجموں میں کچھ فرق کی نشان دہی کی ہے، جس سے ان کی ذہنی بیداری اور باریک بینی و علمی دیانت داری کی تصدیق ہوتی ہے۔

گیارہویں باب میں بابل کی تعمیر، حضرت ابراہیم کا نسب نامہ اور کثرت السنہ کے مسئلہ سے بحث کی گئی ہے، یہودی علما کے مطابق کثرت السنہ فرشتوں کی ایما سے کیا گیا، مگر سید احمد صاحب کا خیال ہے کہ یہ اشارہ دراصل خود خدا کی طرف ہے، چوں کہ وہ کسی کے مشورہ کا محتاج نہیں ہے اور اس نے اہل بابل کو اس تکبر کی سزا دی کہ وہ فلک بوس منارہ بنا کر اپنی عظمت ظاہر کرنا چاہتے تھے، مزید یہ کہ اصل عذاب زبانوں کا اختلاف اور ان کی تکثیریت نہیں، بلکہ سید صاحب کی توجیہ یہ ہے کہ اصل مراد یہ تھی کہ وہ سب لوگ جو شہر اور منارہ بنانے پر یک زبان اور یک ارادہ ہو رہے تھے، خدا نے ان میں تفرقہ ڈال دیا، یہ تشریح جدید ماہرین لسانیات کے واسطے زیادہ قرین عقل معلوم ہوتی ہے، کیوں کہ ماہرین کے نزدیک کسی ایک زبان کا یک لخت متعدد اور آپس میں اجنبی زبانوں میں تبدیل ہو جانا، لسانیات کی تاریخ اور اصول کے مطابق ممکن ہی نہیں۔

دسویں باب کے آخر میں ایک طویل گفتگو (ص ۲۸۱-۳۴۹) طوفان نوح پر ہے، جس میں قدیم و جدید یہودی اور عیسائی علما کی آرا کے علاوہ جدید ماہرین علم طبقات الارض کے نظریات سے بھی استفادہ کیا گیا ہے، طوفان، اس کی تاریخ اور مدت کے علاوہ ثابت کیا ہے کہ یہ طوفان صرف ایک خطہ ارض تک محدود تھا، یہ بات بھی لائق ذکر ہے کہ قرآن میں بھی اس کے عالمی ہونے کی بات نہیں کہی گئی ہے، ماہرین طبقات الارض بھی طوفان کے Global ہونے کو نہیں مانتے، ایک عالم Dr.Basaque کے تخمینہ کے مطابق بائبل سے طوفان کی کل مدت (عبرانی کلنڈر سے) ایک برس تین ماہ نکلتی ہے، مگر سید صاحب نے اس بیان میں دو واقعاتی غلطیاں نکالی ہیں جو بائبل کی نہیں بلکہ ڈاکٹر مذکور کی ہیں، سید صاحب مانتے ہیں کہ کتاب مقدس میں کچھ ایسے مبہم الفاظ ہیں جن کے معنی مختلف بلکہ متضاد نکل سکتے ہیں مگر ان سے طوفان کا عام ہونا ثابت نہیں ہوتا، خود بعض مسلم علما نے غیر مستند مشہور کہانیوں سے دھوکا کھا کر طوفان کا عام ہونا مانا ہے مگر ہم اس غلطی کا الزام قرآن پر نہیں رکھ سکتے (ص ۳۴۶)، ہمارے قرآن مجید سے صاف صاف پایا جاتا ہے کہ طوفان خاص قوم نوح پر تھا۔ (۵)

(باقی)

مراجع وحواشی

(۱) R.B.Sharma: History of Christian Missions-North India Perspectiue (Millat Publications, New Delhi, 2005, Page20-34)

(۲) امداد صابری: فرنگیوں کا جال (دہلی) ۱۹۴۹ء، اس میں ۱۹ویں صدی کے معروف مناظروں اور مناظرہ کرنے والوں کا بالتفصیل ذکر ہے (ص ۱۳۷ تا ۱۶۸)، اسکولوں میں مناظرہ کے چلن کا خصوصی حوالہ بھی شامل ہے اور ص ۶۸ پر ایک واقعہ بیان کیا ہے، جس میں بعض مسلمانوں کو، پادریوں کو، نصاریٰ کہنے پر پھانسی کی سزا دی گئی، آگرہ ان مناظروں کا خاص مرکز تھا، پادری فنڈرس کی سرگرمیوں اور مناظرہ کے گرتے ہوئے معیار پر خاص روشنی ڈالی ہے، سرسید کی تبیین الکلام کا ذکر بڑی پسندیدگی سے کیا ہے۔ (ص ۲۷۳)

(۳) سرسید: تبیین الکلام فی تفسیر التوراۃ والانجیل علی ملۃ الاسلام (مطبوعہ سرسید اکیڈمی، علی گڑھ، ۲۰۰۴ء)، صفحات حوالے اقتباس کے ساتھ ہی قوسین میں دیے گئے ہیں، مگر اکثر صفحات کے نمبر میں تکرار ملے گی، کیوں کہ یہ ایڈیشن تین حصوں کو یکجا کر کے چھاپا گیا ہے مگر ہر حصہ کے صفحات نمبر جداگانہ قائم رکھے گئے ہیں۔

(۴) جلال الدین رومی: مثنوی مولوی معنوی معہ ترجمہ وحواشی از مولانا سجاد حسین (سب رنگ کتاب گھر، دہلی)، دفتر چہارم، ص ۳۴۴۔

(۵) شمس نوید عثمانی نے اپنی کتاب ''اگر اب بھی نہ جاگے تو......'' (مطبوعہ رام پور) میں ویدوں کے اشلوکوں سے بھی طوفان کا ہونا ثابت کیا ہے مگر یہ علاقائی تھا اور کیرا کہ میں واقع ہوا تھا، عثمانی نے حضرت نوح اور منو کی مشابہات پیش کیے ہیں۔ (ص ۳۱ تا ۳۷، ۵۱ تا ۵۴)

سیر الاولیا

جناب فیروز الدین احمد فریدی

''سیر الاولیا'' برصغیر پاک و ہند کے دور اول کے مشائخ چشت کی حیات، سیرت اور ملفوظات پر دنیا میں سب سے پہلی کتاب ہے، جو ساڑھے چھ صدی قبل فیروز شاہ تغلق کے دور حکومت (۷۵۲ھ تا ۷۸۹ھ بہ مطابق ۱۳۵۱ء تا ۱۳۸۸ء) کے وسط میں لکھی گئی اور شائع ہوئی، سیر الاولیا کے آغاز تالیف سے قبل ضیاء الدین برنی کی ''تاریخ فیروز شاہی'' مکمل ہو چکی تھی، تاریخ فیروز شاہی دنیا کے بادشاہوں اور سیر الاولیا دین کے شہنشاہوں کا تذکرہ ہے، کتاب کا بیشتر حصہ خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے ذکر پر مشتمل ہے، مولف کے اپنے الفاظ میں اس کتاب کے لکھنے کا سبب سلطان المشائخ (خواجہ نظام الدین اولیاؒ) کی محبت ہے۔

سیر الاولیا کے مولف سید محمد بن نور الدین مبارک بن محمود کرمانی ہیں جو خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے انتہائی عقیدت مند مرید تھے اور امیر خورد کے لقب سے اس لیے مشہور ہوئے کہ ان کے نامور دادا سید محمد محمود کرمانی، فرید الدین مسعود گنج شکرؒ کے انتہائی عقیدت مند مرید تھے، امیر خورد کرمانی کا سنہ وفات ۷۷۰ھ بہ مطابق ۶۹-۱۳۶۸ء بتایا جاتا ہے۔

سیر الاولیا کا ساڑھے چھ سو سال قدیم کتابت شدہ قلمی نسخہ اب ناپید ہے لیکن اس کتاب کو خواجہ نظام الدین اولیاؒ اور دوسرے اولیاء اللہ کے ذکر کی برکت سے جو شہرت اور مقبولیت ملی، اس کی بنا پر پچھلی صدیوں کے دوران، ان کی خدا جانے کتنی نقول در نقول کتابتیں ہو چکی ہوں گی اور اس کے قلمی نسخے آج بھی کتنے ہی لوگوں کے پاس ہوں گے، زیر نظر مضمون میں سیر الاولیا کے چار قلمی نسخوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔

کھتوال ہاؤس، A-54، سٹریٹ 15، باتھ آئی لینڈ، کراچی، پاکستان۔

قدیم ترین معلومہ قلمی نسخہ جس کی کتابت چار صدی پہلے عہد اکبری کے آخری سال ۱۶۰۵ء میں مکمل ہوئی، کولکتہ (بھارت) کی ایشیاٹک سوسائٹی کے میوزیم میں ہے، دوسرا قدیم ترین مصدقہ نسخہ جس کی کتابت سوا تین صدی قبل اورنگ زیب عالم گیر کے عہد حکومت کے وسط میں ۱۶۸۲ء میں مکمل ہوئی، لندن کی برٹش لائبریری میں ہے، تیسرا قلمی نسخہ جس کا اس مضمون میں جائزہ لیا گیا ہے، کراچی کے قومی عجائب خانے میں ہے، جس پر سنہ کتابت یا کاتب کا نام درج نہیں، چوتھا قلمی نسخہ جسے تقریباً سوا صدی پہلے کتاب کی شکل میں دلی سے ۱۸۸۵ء میں شائع کیا گیا، چرنجی لال اڈیشن کہلاتا ہے، بیسویں صدی عیسوی میں برصغیر پاک و ہند کے بیشتر مورخین، محققین اور مصنفین نے اپنی کتابوں اور مقالوں میں جب اور جہاں سیر الاولیا کا ذکر کیا ہے یا اس کے حوالے دیے ہیں تو ان کی مراد چرنجی لال اڈیشن سے تھی، اس لیے ہم اپنے جائزے کا آغاز چرنجی لال اڈیشن سے کرتے ہیں۔

چرنجی ال اڈیشن جس قلمی نسخے کی بنیاد پر جدید پریس سے چھپوایا گیا، اس قلمی نسخے کی تاریخ خاصی دل چسپ، قدامت غیر متعین، بعض فقروں کا مطلب واضح اور چند بیانات کی صحت بہت مشکوک ہے، حقیقت تو یہ ہے کہ اس مطبوعہ اڈیشن کے نہ صرف بعض فقروں بلکہ کئی پورے صفحات کے بارے میں قطعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ ہرگز امیر خورد کرمانی کی تحریر نہیں بلکہ ''بعد میں ہونے والے اضافے'' ہیں، تاہم گزشتہ صدیوں کے دوران یہ اضافی فقرے یا صفحات صرف عوام الناس میں ہی نہیں بلکہ کئی فاضل مورخین اور محققین کی نظروں میں بھی امیر خورد کرمانی کی تحریر اور سیر الاولیا کا جزء سمجھے جاتے رہے ہیں، یہ امیر خورد کرمانی پر ظلم ہے اور اب وہ وقت آگیا ہے کہ اس ظلم کی نشان دہی کردی جائے، یہ اکیسویں صدی کے کندھوں پر چودہویں صدی کا قرض ہے اور صرف قرض ہی نہیں بلکہ فرض بھی ہے۔

بیسویں صدی عیسوی میں دلی اور لاہور کے جن مختلف اشاعتی اداروں نے سیر الاولیا کے اردو تراجم شائع کیے، ان میں لاہور کا موجودہ اردو سائنس بورڈ بھی شامل تھا، اکیسویں صدی آئی تو ۲۰۰۴ء میں اردو سائنس بورڈ نے سیر الاولیا کے چرنجی لال فارسی اڈیشن کے اردو ترجمے کو پانچویں بار شائع کیا جس میں ''سیر الاولیا کی تاریخی سرگزشت'' کے زیر عنوان چرنجی لال فارسی

اڈیشن (۱۸۸۵ء) کے بارے میں ایک دل چسپ معلوماتی نوٹ ہے جو چرنجی لال فارسی اڈیشن کے آخر میں دیے گئے چار صفحاتی نوٹ اور اسی اڈیشن کے آغاز میں دیے ہوئے دو صفحاتی دیباچے سے اخذ کیا گیا ہے، اس معلوماتی نوٹ سے چند اقتباسات یہ ہیں:

"۱۱۵۰ھ (بہ مطابق ۱۷۳۷ء) سیر الاولیا کا ایک مخطوطہ سید عبداللہ کو ملا جو سلطان المشائخ (خواجہ نظام الدین اولیاؒ) کی اولاد (؟) میں سے تھے، یہ نسخہ ان سے گم ہوگیا، ایک مدت کے بعد اتفاق سے بازار سے سید عبداللہ کو (سیر الاولیا کا) ایک اور مخطوطہ ملا لیکن یہ خاصا بدخط تھا، سید عبداللہ نے اس نسخے کو شیخ نور محمد سے صاف کرایا، جو خوش نویس بھی تھے اور فارسی نظم ونثر پر بھی گہری نظر رکھتے تھے، پھر انہوں نے صرف ونحو کی تحصیل خاص طور پر کی تھی، گویا وہ اس نسخے کو صاف کرنے کے لیے موزوں ترین انسان تھے، کچھ دن بعد حبیب اللہ نامی ایک بزرگ کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ سید عبداللہ کا نسخہ جسے شیخ نور محمد نے صاف کیا تھا، انہیں عاریتاً مل جائے لیکن ایسا نہ ہوسکا، انہیں (حبیب اللہ کو) بھی بازار سے ایک مخطوطہ جو غلطیوں سے پُر اور نہایت بدخط تھا، ہاتھ لگا، ایک مرتبہ اتفاق سے حبیب اللہ کی ملاقات سید عبداللہ سے ہوئی تو اس مخطوطے کا تذکرہ ہوا اور دونوں اصحاب نے طے کیا کہ ان مخطوطوں کی تصحیح ومقابلہ کیا جائے، چنانچہ مختلف شہروں سے اس کے نو نسخے جمع کیے گئے (اور) ان میں سے دو نسخوں کو تیار کیا گیا (ایک سید عبداللہ اور دوسرا حبیب اللہ کے لیے)۔

۱۲۱۷ھ (بہ مطابق ۱۸۰۲ء) میں شیخ بدرالاسلام فخری نظامی نے (اسے) (شیخ نور محمد کے لکھے ہوئے نسخے سے نقل کیا، شیخ بدرالاسلام کا بیان ہے کہ (شیخ) نور محمد کا نسخہ اگرچہ (انہوں نے) کمال صحت کے ساتھ نقل کیا ہے لیکن پھر بھی اصل نسخے میں جو اسقام تھے، ان کو اسی طرح نقل کردیا ہے لیکن بعض جگہ ادب سے متجاوز ہوکر ان کو درست کیا ہے۔

شیخ بدرالاسلام فخری نظامی کا یہ مخطوطہ جو شیخ نور محمد کاتب کے مخطوطے کی ......

نقل ہے، ملکہ وکٹوریہ کے عہد ۴۷ جلوس (۱۸۸۴ء) میں منشی چرنجی لال آنجہانی کو سید شاہ ظہور علی سے جو درگاہ موصوف (خواجہ نظام الدین اولیاؒ کی درگاہ) کے قاضی زادوں میں تھے، دست یاب ہوا، سیر الاولیا کا مخطوطہ جو منشی چرنجی لال کے ہاتھ لگا، وہ (سلسلۂ چشتیہ کے نامور بزرگ) مولانا شیخ فخر الدین نظامی چشتی کے دستخط سے مزین تھا، اس مخطوطے کی طباعت کی تکمیل آٹھ ماہ میں ہوئی، سنہ تکمیل ۱۳۰۲ھ (بہ مطابق ۱۸۸۵ء) ہے۔

آخر میں، میں (یعنی مترجم) یہ ضرور عرض کروں گا کہ چرنجی لال کے اس مطبوعہ فارسی نسخے میں جو عبارات بالخصوص عربی عبارات ہیں، وہ بیشتر غلطیوں سے پُر ہیں، یوں تو فارسی عبارات بھی غلطیوں سے مبرا نہیں لیکن ان کی تعداد عربی عبارات کے اسقام کے مقابلے میں کم ہے"۔

مندرجہ بالا اقتباسات سے معلوم ہوا کہ سیر الاولیا کے قلمی نسخے کو ایک بہت قابل خوش نویس سے کتابت کرانے کے باوجود، سید عبداللہ اس نئے کتابت شدہ نسخے سے بھی مطمئن نہ تھے، اگر ہوتے تو یہ فیصلہ کیوں کرتے کہ ہندوستان کے مختلف شہروں سے سیر الاولیا کے نو قلمی نسخے اس غرض سے حاصل کیے جائیں کہ انہیں سامنے رکھ کر سیر الاولیا کا صحیح متن مرتب کیا جائے؟

مندرجہ بالا اقتباسات سے یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ نو قلمی نسخوں کے مقابلے اور تصحیح کے بعد دو قلمی نسخے تیار کیے گئے لیکن یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ان دو نئے قلمی نسخوں سے کیا استفادہ کیا گیا؟ اور وہ کہاں گئے؟ بہرحال یہ واضح ہے کہ چرنجی لال اڈیشن کی تیاری میں ان دو قلمی نسخوں سے استفادہ نہیں کیا گیا بلکہ اسے شیخ نور محمد کا وہی کتابت شدہ قلمی نسخہ سامنے رکھ کر کتابت کیا گیا جس سے غیر مطمئن ہونے کی بنا پر ہی اس کی کتابت مکمل ہونے کے بعد اور اس کے باوجود دو قلمی نسخوں کی ازسرنو کتابت کا اہتمام کرنا پڑا تھا، مزید برآں ان اقتباسات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دو صدیاں قبل ۱۸۰۲ء میں شیخ بدرالاسلام فخری نظامی نام کے ایک کاتب نے جب شیخ نور محمد کے کتابت شدہ اسی قلمی نسخے کو نقل کیا تو وہ شیخ نور محمد کے تصحیح کردہ قلمی نسخے میں بعض جگہ مزید تصحیح کرنے پر مجبور ہوگئے جسے انہوں نے ادب سے متجاوز ہونا قرار دیا ہے، تاہم بہت سے مقامات

پروہ ادب سے متجاوز نہیں ہوئے اور ان مقامات پر شیخ نور محمد کے (تصحیح شدہ) قلمی نسخے میں جو اسقام انہیں نظر آئے، وہ انہوں نے من وعن نقل کر دیے۔

۱۸۸۴ء میں سیر الاولیا کا جو قلمی نسخہ چرنجی لال کے ہاتھ لگا اور جسے اس نے طبع کرایا وہ شیخ بدر الاسلام تخری نظامی کا کتابت شدہ مندرجہ بالا نسخہ تھا، بیسویں صدی عیسوی میں جب موجودہ اردو سائنس بورڈ لاہور نے انیسویں صدی عیسوی میں چھپنے والے چرنجی لال اڈیشن کا اردو ترجمہ کرایا تو مترجم کو بھی لکھنا پڑا کہ چرنجی لال اڈیشن میں درج شدہ بیشتر عربی عبارات غلطیوں سے پُر ہیں اور فارسی عبارات بھی غلطیوں سے مبرا نہیں، ایک کاتب یا مترجم ایک قلمی نسخے میں پائی جانے والی عبارات کی غلطیوں کی نشان دہی تو کر سکتا ہے لیکن اس نسخے میں "بعد میں اضافہ ہونے والے" فقرات یا صفحات کی نشان دہی نہیں کر سکتا۔

بالائی سطور میں اقتباسات نقل کرنے اور ان کے چند پہلوؤں کی نشان دہی کا مقصد یہ ہے کہ جب سیر الاولیا کے قلمی نسخوں یا ان پر مبنی مطبوعہ کتابوں (مثلاً چرنجی لال اڈیشن) یا ان مطبوعہ کتابوں کے اردو تراجم پڑھنے والے اکیسویں صدی عیسوی کے قارئین کو سیر الاولیا میں درج شدہ بعض واقعات، عبارات یا اشعار کی صحت پر شبہ ہو تو انہیں یہ فیصلہ کرنے میں سہولت ہو کہ ان درج شدہ تحریروں پر آنکھ بند کر کے یقین کر لینا درست نہیں ہوگا۔

سیر الاولیا کے چرنجی لال اڈیشن کے بارے میں علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے مشہور محقق، مورخ اور مرحوم پروفیسر محمد حبیب کا ایک مختصر تبصرہ پیش ہے جو انہوں نے اپنی کتاب "حضرت نظام الدینؒ - حیات اور تعلیمات" (۱۹۷۲ء) کے صفحہ نمبر ۱۴ پر تحریر کیا ہے:

"سیر الاولیا کے فارسی نسخے کو شعبان ۱۳۰۲ھ (بہ مطابق مئی ۱۸۸۵ء) میں لالہ چرنجی لال، مالک و مہتمم مطبع محب ہند فیض بازار، دہلی نے شائع کیا، اب (۱۹۷۲ء میں) یہ چھپی ہوئی کتاب نہیں ملتی اور اس کا کاغذ بھی اس قدر خراب ہوگیا ہے کہ موڑنے سے پھٹ جاتا ہے"۔

اسی صفحے کے زیریں حاشیے پر پروفیسر صاحب نے لکھا:

"سیر الاولیا (مطبوعہ چرنجی لال) کی ایک جلد مسلم یونی ورسٹی (علی گڑھ)

لائبریری میں تھی، میں نے اس کو تین چار دفعہ پڑھا لیکن ہر صفحہ الٹنے سے پھٹ جاتا تھا، اس لیے کتاب بیکار ہوگئی، پروفیسر (خلیق احمد) نظامی صاحب کے پاس "سیر الاولیا" کا نسخہ ہے اور انہوں نے (میری) یہ کتاب تیار کرنے کے لیے مجھے اپنی کتاب مستعار دی ہے لیکن میں اس کو استعمال کرتے ہوئے ڈرتا ہوں"۔

چرنجی لال اڈیشن میں سیر الاولیا کا متن ۵۹۲ صفحات پر چھاپا گیا ہے، اس کی طباعت کے ۹۳ برس بعد ۱۹۷۸ء میں مرکز تحقیقات فارسی ایران وپاکستان، اسلام آباد نے چرنجی لال اڈیشن کو لاہور سے شائع کیا، لاہور ۱۹۷۸ء اڈیشن کے صفحات کی تعداد ۶۰۲ ہے، پہلے دس صفحات "فہرست مندرجات" اور (چرنجی لال کے یکم مئی ۱۸۸۵ء کے تحریر کردہ) دیباچے پر مشتمل ہیں اور اس کے بعد کتاب کا متن صفحہ نمبر ۱۱ سے شروع ہوتا ہے، اس تفصیل میں جانے اور اسے بیان کرنے کی ضرورت یوں محسوس ہوئی کہ بیسویں صدی کے مورخین، محققین اور مصنفین نے اپنی تحریروں میں جہاں چرنجی لال (دہلی ۱۸۸۵ء) اڈیشن کے کسی خاص صفحے کا حوالہ دیا ہے تو وہ لاہور ۱۹۷۸ء فارسی اڈیشن میں دس صفحات کے بعد ہوگا، لاہور ۱۹۷۸ء اڈیشن میں طباعت کی غلطیاں بھی ہیں، مثلاً پورا صفحہ نمبر ۱۸۳، صفحہ نمبر ۱۸۱ کی تکرار ہے، صفحہ نمبر ۱۸۳ پر جو متن ہونا چاہیے تھا وہ کراچی میوزیم کے قلمی نسخے کے مفروضہ صفحہ نمبر ۲۰۶ پر درج ہے لیکن چرنجی لال اڈیشن میں نہیں۔

سیر الاولیا کے چرنجی لال اڈیشن کا آغاز ان فقروں سے ہوتا ہے:

"حمد متواتر و شکر متکاثر بر خدائے را کہ مکرم گردانید اولیائے خود را بزہد در دنیا تا بآرایش آں التفات نہ نمانید و مصفّٰے گردانید از آنکہ غیر حضرت اُو را ملاحظہ نہ نمانید"۔

پے در پے حمد اور کثرت سے شکر اس خدا کے لیے ہے، جس نے اپنے دوستوں کو زہد سے سرفراز فرمایا، تا کہ دنیا کی آرائش انہیں اپنی جانب متوجہ نہ کر سکے اور اس نے مصفّٰی کیا کہ وہ خدا کے سوا کسی اور کی طرف دیکھیں۔

چرنجی لال اڈیشن کا اختتام ان فقروں پر ہوتا ہے:

"بہ ضرورت بر تخت سلطنت جلوس فرمودو مردم از محنت واندوہ آسودہ شدند، تاریخ

(فیروز شاہ نے) مجبور ہو کر تخت و تاج سنبھالا اور لوگوں نے رنج و غم سے نجات پائی،

وفات سلطان فیروز شاہ فوت فیروز است کہ بمقصد وہشتاد و نُہ است و مدت سلطنت اُوسی و ہفت سال بود، تم بعونہ وہو العلے العظیم"۔	سلطان فیروز شاہ کی تاریخ وفات "فوت فیروز" ہے جس سے سنہ ۷۸۹ھ (بہ مطابق ۱۳۸۸ء) نکلتا ہے، اس کی حکومت کی مدت ۳۷ سال تھی، تم بعونہ وہو العلے العظیم۔

امیر خورد کرمانی کا مبینہ سنہ وفات ۷۷۰ھ جب کہ فیروز شاہ تغلق کا سال وصال ۷۸۹ھ ہے، کیا ایک شخص (امیر خورد کرمانی) اپنی وفات کے بعد کسی ایسے شخص (فیروز شاہ تغلق) کا سال وصال لکھ سکتا ہے جو متوفی کے مرتے دم تک زندہ سلامت ہو اور ۱۹ برس بعد وفات پائے؟

اب ذکر ہے سیر الاولیا کے اس قلمی نسخے کا جو ایشیاٹک سوسائٹی کولکتہ کے میوزیم میں ہے، اس کی کتابت ۲۰ر رمضان ۱۰۱۳ھ (بہ مطابق ۳۰ر جنوری ۱۶۰۵ء) کو مکمل ہوگئی تھی، جس کا اندراج اس مخطوطے کے آخری صفحات میں صراحتاً موجود ہے، اس طرح یہ مخطوطہ شہنشاہ اکبر کی وفات سے چند ماہ قبل، عہد اکبری کے آخری سال یعنی ۱۶۰۵ء میں مکمل ہوا، تاہم حوالے کی تمام کتابوں میں اس مخطوطے کی تاریخ کتابت، ایک غلط فہمی کی بنا پر ۱۴ر جمادی الاولی ۱۰۴۰ھ (بہ مطابق ۲۹ر نومبر ۱۶۳۰ء) لکھی جاتی رہی ہے، اس غلط فہمی کا سبب اگلے صفحات میں واضح ہوجائے گا۔

سیر الاولیا کے اس معلومہ قدیم ترین نسخے کا آغاز اس فقرے سے ہوتا ہے:

"بترس از دوستی کہ حاجیاں را چوں کافران روم می کشند و با حاجیاں غزاے کنند"۔	اس دوست سے ڈر جو حاجیوں کو روم کے کافروں کی طرح قتل کرتا اور ان کے ساتھ جنگ و جدل کرتا ہے۔

یہ فقرہ اس فقرے سے یکسر مختلف ہے جس سے چرنجی لال اڈیشن اور، جیسا کہ ہم بعد میں دیکھیں گے، برٹش لائبریری لندن اور کراچی میوزیم کے سیر الاولیا کے قلمی نسخوں کا آغاز ہوتا ہے، وجہ یہ ہے کہ سیر الاولیا کے کولکتے کے مخطوطے کے بہت سے ابتدائی اوراق غائب ہیں اور مندرجہ بالا فقرہ چرنجی لال فارسی اڈیشن (لاہور ۱۹۷۸ء) کے صفحہ نمبر ۴ کی آخری سطر ہے، دلچسپ بات یہ ہے کہ کولکتے کے مخطوطے کے آغاز کے کئی صفحات تو غائب ہیں لیکن آخر میں کئی صفحات کا اضافہ بعد میں کیا گیا ہے جن کا ذکر اس تحریر کے اگلے صفحات میں آئے گا، موجودہ حالت میں، اس آغاز

میں مکمل اور آخر میں اضافہ شدہ مخطوطے کے کل ۳۵۹ر اوراق ہیں جو ۷۱۷ صفحات بنتے ہیں، یہ سیر الاولیا کا قدیم ترین معلومہ مخطوطہ تو یقیناً ہے لیکن اسے سیر الاولیا کا قدیم ترین مکمل اور مستند مخطوطہ نہیں کہا جاسکتا، یہ مخطوطہ پہلے فورٹ ولیم کالج کولکتا کی لائبریری میں تھا اور اب ایشیاٹک سوسائٹی کولکتے کے میوزیم میں "Persian Society Collection - 243" کی درجہ بندی کے تحت محفوظ ہے۔

اس مخطوطے کا اختتام اس فقرے پر ہوتا ہے جو ورق نمبر ۳۵۰ (a) پر درج ہے:

"و نفس آں بادشاہ زادہ در کار شد"۔ اور اس طرح شہزادے کی پیش گوئی پوری ہوئی۔

مندرجہ بالا فقرہ اس حکایت کا اختتام ہے جو سیر الاولیا کے علاوہ "فوائد الفواد" کی چوتھی جلد کی ۳۵ ویں مجلس میں بھی درج ہے، جو ۲۶ر شوال ۷۱۶ھ بہ روز بدھ منعقد ہوئی، اس حکایت میں ایک صاحب کشف بادشاہ کا ذکر ہے جسے ایک دن یہ القا ہوا کہ اس کی موت قریب ہے اور اس کے مرنے کے بعد اس کا حبشی غلام اس کی قلم رو کا بادشاہ اور اس کی ملکہ کا شوہر بنے گا، بادشاہ کی یہ پیش گوئی پوری ہوئی۔

اس فقرے کے بعد کولکتے کے مخطوطے میں ڈیڑھ اوراق (تقریباً ڈھائی صفحات) خالی ہیں جس سے یہ واضح تاثر ملتا ہے کہ مخطوطہ اختتام پذیر ہوگیا، یہ ایک اہم نکتہ ہے جس کی مزید وضاحت ضروری ہے، مندرجہ بالا فقرہ "اور اس طرح شہزادے کی پیش گوئی پوری ہوئی" سیر الاولیا کے آخری یعنی دسویں باب کے ۲۷ ویں نکتے کا آخری فقرہ ہے، اس باب کا طویل عنوان چرنجی لال اڈیشن میں اس طرح درج ہے:

"حضرت سلطان المشائخ کے بعض ملفوظات اور نوشتے جو اس سے پہلے ابواب میں نہیں لکھے گئے اور اس بے چارے نے اپنی سمجھ کے مطابق لکھے ہیں، یہ باب چوبیس نکتوں پر مشتمل ہے"۔

درحقیقت یہ بات ۲۴ کی بجائے ۲۸ نکتوں پر مشتمل ہے، عنوان میں ۲۴ نکات کا صراحت سے ذکر ہونے کے باوجود اس باب کا ۲۸ نکات پر مشتمل ہونا عجیب سا لگتا ہے اور یہ شبہ ہونا فطری امر ہے کہ کیا اس باب میں، بعد میں، چار نکات کا اضافہ تو نہیں کردیا گیا، برٹش

لائبریری لندن کے مخطوطے کے مطابق یہ باب ۲۷ نکات پر مشتمل ہے، اس باب کے پہلے ۲۷ نکات خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے ملفوظات یا ان نگارشات پر مشتمل ہیں جو امیر خورد کرمانی مولف سیر الاولیا کی نظر سے گزریں، ۲۷ نکات میں سے ۲۱ نکات کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے کہ ''سلطان المشائخ نے فرمایا''، پانچ نکات کا آغاز یوں ہوتا ہے کہ میں نے سلطان المشائخ کے دست مبارک سے لکھا ہوا دیکھا ہے اور ایک نکتے کا آغاز اس جملے سے ہوتا ہے کہ ''حضرت سلطان المشائخ سے سوال کیا گیا'' اس طرح جملہ ۲۷ نکات کی ابتدا خواجہ صاحبؒ کے ذکر اور ان کے حوالے سے ہوتی ہے، ہر نکتے کے نہ صرف آغاز بلکہ اس کے بعد کے متن میں بھی ان کا نام بار بار آتا ہے، ظاہر ہے کہ جب باب کا عنوان ہی ''حضرت سلطان المشائخ کے بعض ملفوظات اور نوشتے'' ہو تو جہاں ہر نکتے کے آغاز متن میں ان کا ذکر آنا فطری ہے، وہاں متن میں ان کا ذکر تو لازمی ہے، اگر ان کا ذکر نہ ہوگا تو بھلا کس کا ہوگا؟

اس طرز تحریر کے برعکس اور ''شہزادے کی پیش گوئی پوری ہوئی'' کے فقرے سے بعد کئی صفحات پر مشتمل جو طویل اور بعض مقامات پر گنجلک تحریر، ۲۸ ویں اور آخری نکتے کے ذیل میں نظر آتی ہے، اس کا انداز تحریر پچھلے ۲۷ نکات سے یکسر مختلف ہے، ۲۸ ویں نکتے کا عنوان ہے:

''ان لوگوں کے بارے میں جو ہر وقت یاد الٰہی میں مستغرق رہتے ہیں،
یہاں تک کہ انہیں کھانا پینا بھی یاد نہیں رہتا''۔

پہلی بات یہ ہے کہ اس عنوان کے نیچے پورے متن میں یاد الٰہی میں اس طرح مستغرق رہنے والوں کا ذکر بہت کم ملتا ہے، دوسری بات یہ ہے کہ پچھلے تمام ۲۷ نکات کے برعکس ۲۸ ویں اور آخری نکتے کے آغاز میں خواجہ نظام الدین اولیاؒ کا ذکر سرے سے موجود ہی نہیں، تیسری بات یہ ہے کہ ۲۸ ویں نکتے کے متن میں مشائخ چشت کی سیرت کی بجائے جو ''سیر الاولیا'' کا نام بتاتا ہے یا خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے فرمودات اور نگارشات کی بجائے جو ۲۸ نکات پر مشتمل اس دسویں باب کا عنوان ہے، ۲۸ ویں نکتے کا بیشتر متن خاندان غلامان، خاندان خلجی اور خاندان تغلق کے بادشاہوں اور ان بادشاہوں کے بیٹوں، پوتوں، وزراء اور امرا کے ذکر سے پُر ہے جن میں سے بیشتر یاد الٰہی کے علاوہ دیگر مشاغل میں مستغرق رہتے تھے، ۲۸ ویں نکتے کا متن اولیا اللہ کی سیرت

سے زیادہ تاریخ فیروز شاہی کا باب معلوم ہوتا ہے اور بعض مقامات پر تو پورے فقرے تاریخ فیروز شاہی سے لیے گئے ہیں، چوتھی اور آخری بات یہ ہے کہ امیر خورد کرمانی نے خواجہ نظام الدین اولیا کے لیے پوری کتاب میں ''سلطان المشائخ'' کا لقب استعمال کیا ہے لیکن اس نکتے کے متن میں ایک جگہ خواجہ صاحب کو شیخ الشیوخ ''محبوب الٰہی'' اور دوسری جگہ ایک طویل لقب یعنی ''شیخ الشیوخ العالم سید نظام الحق والدین محمد احمد بدایونی بخاری چشتی'' سے یاد کیا گیا ہے۔

مندرجہ بالا چار باتوں کی روشنی میں، ذہن میں یہ قوی تاثر ابھرتا ہے کہ نہ صرف ۲۸ ویں نکتے کا آخری فقرہ جو ''تاریخ وفات سلطان فیروز شاہ'' سے تعلق رکھتا ہے، بلکہ اس نکتے کا پورا متن امیر خورد کے قلم سے نہیں نکلا، یہ سب ''بعد کا اضافہ'' ہے جو ان سے غلط طور پر منسوب کردیا گیا ہے، ۲۸ ویں نکتے کا متن کولکتہ کے قلمی نسخے میں ڈیڑھ خالی اوراق یا ڈھائی خالی صفحات کے بعد (جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے)، ایک ضمیمے کی صورت میں، اس قلمی نسخے کے ورق نمبر ۳۵۲ (a) سے ورق نمبر ۳۵۹ (a) کے تقریباً اخیر تک (یعنی اس ورق کی آخری تین سطریں چھوڑ کر) محیط ہے، ورق نمبر ۳۵۹ (a) کے نچلے حصے میں یہ تحریر رقم ہے:

''بہ ضرورت بر تخت سلطنت جلوس فرمود مردم از محنت واندوہ آسود،
تاریخ وفات سلطان فیروز شاہ فوت ۷۸۹ فیروز است کہ ہفصد و ہشتاد و نہ
است، مدت سلطنت او سی و ہفت سال بود''۔

املا کے تفاوت اور حروف اور ہجوں کی اغلاط کو نظر انداز کرتے ہوئے یہ تقریباً وہی تحریر ہے جو چرنجی لال فارسی اڈیشن (لاہور ۱۹۷۸ء) میں درج ہے، اس تحریر کے فوراً بعد کولکتے کے قلمی نسخے میں یہ فقرہ درج ہے:

''سنہ یک ہزار یزدہ سال از ہجرت حضرت رسالتؐ بود کہ تمام شد در
ماہ رمضان روز چہار شنبہ تاریخ بیستم''۔

''اگر ''یزدہ'' سے مراد ''یازدہ'' یعنی گیارہ کا ہندسہ لیا جائے تو اس قلمی نسخے کی کتابت ۲۰ رمضان ۱۰۱۱ھ (بہ مطابق ۲۱ رفروری ۱۶۰۳ء) مکمل ہونا قرار پائے گی جو ہجری عیسوی تقویم کے مطابق پیر کا دن بنتا ہے، چہار شنبہ یا بدھ نہیں، اگر ''یزدہ'' سے مراد ''سیزدہ'' ہے جو

قرین قیاس ہے تو کتابت کی تکمیل ۲۰رمضان ۱۰۱۳ھ (بہ مطابق ۳۰رجنوری ۱۶۰۵ء) کو ہوئی جو تقویم کے مطابق بدھ کا دن تھا اور قلمی نسخے میں بھی بدھ کا ہی ذکر ہے، چنانچہ ۳۰رجنوری ۱۶۰۵ء (بہ مطابق ۲۰رمضان ۱۰۱۳ھ) کولکتے کے سیر الاولیا کے مخطوطے کی تاریخ کتابت ہے، قلمی نسخے کی کتابت کی تکمیل پر پہلے "تمام شد" کے الفاظ درج ہیں اور اس کے بعد ۲۰ر رمضان ۱۰۱۳ھ کی یہ تاریخ لکھی گئی ہے، جس کے بعد قلمی نسخے کو اختتام پذیر ہو جانا چاہیے تھا۔

ایسا ہوا نہیں "تمام شد" کے الفاظ لکھنے اور اس کے بعد تاریخ کتابت تک درج کرنے کے بعد "کولکتے" کے قلمی نسخے کے ورق نمبر ۳۵۹ (a) کی آخری تین سطروں سے ورق نمبر ۳۶۰ (b) تک، تقریباً ڈھائی صفحات پر محیط ایک مزید اضافی تحریر موجود ہے جو نعمت اللہ نوری نامی کسی بزرگوار کے ایما پر ۲۵ برس بعد اس قلمی نسخے میں شامل کی گئی، لطف یہ ہے کہ اس اضافی تحریر کے آغاز میں گویہ صراحتاً درج ہے کہ "نعمت اللہ نوری صاحب کے ایما پر شامل کی گئی ہے"، اس کے باوجود اس اضافی تحریر کو بھی امیر خورد کرمانی کی سیر الاولیا کا حصہ سمجھا گیا، اب اس کو کوئی کیا کہے؟ اور اس کا کیا علاج کرے؟

ڈھائی صفحات کی اس مزید اضافی تحریر کے مطابق (جو چرنجی لال اڈیشن میں اس کے متن کا حصہ بنادی گئی ہے)، نعمت اللہ نوری صاحب کا تعلق خواجہ نظام الدین اولیاؒ کی ننھیال سے تھا اور جب نعمت اللہ نوری صاحب نے سیر الاولیا پڑھنے کے بعد دیکھا کہ امیر خورد کرمانی نے سیر الاولیا میں خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے نانا (اور دادا) کا شجرۂ نسب نہیں لکھا تو نعمت اللہ نوری صاحب نے، ان کے بہ قول "خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے اشارے پر" خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے نانا کا شجرہ اور ان کے نانا کی اولاد ذرینہ سے اپنا تعلق اور اپنا شجرۂ نسب (۲۵ برس بعد) سیر الاولیا کے مخطوطے کے آخر میں شامل کر دیے، نعمت اللہ نوری صاحب کے بہ قول یہ شجرے "سند صحیح" کے ذریعے ان تک پہنچے تھے، اس سند صحیح کی سند تو درج نہیں، تاہم ان شجرہ ہائے نسب کے سیر الاولیا میں بلا سند اندراج سے نعمت اللہ نوری صاحب کا خواجہ نظام الدین اولیاؒ سے خاندانی تعلق ظاہر کر دیا گیا، ان شجرہ ہائے نسب کی شمولیت کے بعد کولکتے کا قلمی نسخہ اب ان الفاظ پر ختم ہوتا ہے:

"والدہ حضرت فاطمۃ الزہرا بنت رسول اللہؐ تمام شد"۔

اس طرح بار دگر "تمام شد" کے الفاظ لکھنے کے بعد مخطوطے کی تاریخ کتابت ۴رجمادی الاولی ۱۰۴۰ھ (بہ مطابق ۲۹رنومبر ۱۶۳۰ء) درج ہے، جسے حوالے کی سب ہی کتب میں اس قدیم ترین قلمی نسخے کی تاریخ کتابت کے طور پر بتایا جاتا رہا ہے۔

بالائی سطور میں لکھا گیا تھا کہ کولکتے کے مخطوطے کے آخر میں پائے جانے والے ڈھائی صفحات کی یہ مزید اضافی تحریر چرنجی لال اڈیشن کے متن کا حصہ بنادی گئی، اس کا مختصر ذکر دل چسپی کا حامل ہوگا جس سے معلوم ہوگا کہ جو سیر الاولیا ہم امیر خورد کرمانی کی تحریر سمجھ کر پڑھتے ہیں، اس میں مختلف افراد نے مختلف اوقات میں کیسے کیسے اضافے کیے۔

ڈھائی صفحات کے اس "اضافے" میں ڈیڑھ صفحات کا مزید "اضافہ در اضافہ" کرنے کے بعد اسے چرنجی لال (لاہور ۱۹۷۸ء) اڈیشن میں، صفحات ۱۰۶ سے ۱۰۹ تک سیر الاولیا کے متن کا حصہ بنادیا گیا، چرنجی لال اڈیشن میں سیر الاولیا کا متن ۵۹۲ صفحات پر مشتمل ہے، اس طرح یہ اضافہ جو ۱۶۳۰ء میں سیر الاولیا کے آخر میں کیا گیا تھا، ۱۸۸۵ء (بلکہ اس سے قبل کسی نامعلوم سنہ) میں سیر الاولیا کے آخری صفحات سے منتقل ہو کر چرنجی لال اڈیشن کے ابتدائی صفحات میں طبع شدہ متن کا باقاعدہ حصہ بن گیا اور ستم ظریفی دیکھیے کہ چرنجی لال اڈیشن کے متن کے ابتدائی صفحات میں ہونے والا یہ صریح اضافہ ان واشگاف الفاظ کے ساتھ شروع ہوتا ہے:

"جب فقیر نعمت اللہ نوری نے دیکھا کہ سیر الاولیا میں (امیر خورد کرمانی نے) حضرت سلطان المشائخ کا سلسلۂ نسب پدری و مادری درج نہیں کیا تو اپنے آباو اجداد کا شجرہ...... جو مجھ تک سند صحیح کے ساتھ پہنچا ہے، حضرت سلطان المشائخ کے اشارے پر، میں نے سیر الاولیا میں لکھ دیا ہے جسے انشاء اللہ دنیا بھر کے صاحب دل دیکھیں گے"۔

کسی کتاب میں پائے جانے والی تحریر کے علی الاعلان اضافی ہونے کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہو سکتا ہے کہ اضافہ کرنے والا اپنی اضافی تحریر کے پہلے فقرے میں خود یہ اعلان کردے کہ اب وہ اضافہ کرنے والا ہے، سیر الاولیا کے مخطوطوں کے متن میں "بعد میں ہونے والے اضافوں" یا "اضافہ در اضافہ" کی اس سے واضح مثال اور ثبوت نہیں مل سکتے۔

سیر الاولیا کا دوسرا قدیم ترین اور مصدقہ قلمی نسخہ برٹش لائبریری لندن میں ہے، جس کی کتابت ۱۰؍شوال ۱۰۹۳ھ (بہ مطابق ۲؍اکتوبر ۱۶۸۲ء) کو مکمل ہوئی، اس طرح یہ قلمی نسخہ جو سوا تین سو سال پرانا ہے، اورنگ زیب عالم گیر کے عہد حکومت (۱۶۵۸-تا۱۷۰۷ء) کے وسط میں لکھا گیا، اس کے کل ۳۰۲؍اوراق ہیں جن کے ۶۰۳ صفحات بنتے ہیں، یہ قلمی نسخہ پہلے انڈیا آفس لندن کی لائبریری میں تھا، ۱۹۹۸ء میں جب نوتعمیر شدہ برٹش لائبریری کی عمارت لندن میں مکمل ہوئی تو یہ قلمی نسخہ وہاں منتقل کردیا گیا اور اب اس کی چوتھی منزل میں Delhi Persian 668 as in C.A.Storey کی درجہ بندی کے تحت محفوظ ہے۔

لندن کے قلمی نسخے کا آغاز ان ہی فقروں سے ہوتا ہے جن سے چرنجی لال فارسی اڈیشن (لاہور ۱۹۷۸ء) کی ابتدا ہوئی تھی، تاہم لندن کے مخطوطے کا آخری فقرہ جو اس کے صفحہ نمبر ۶۰۳ پر درج ہے، یہ ہے:

''نفس آں بادشاہ زادہ در کار رشد''۔

یاد رہے کہ یہی وہ فقرہ ہے جس پر کولکتے کا قلمی نسخہ ورق نمبر ۳۵۰ (a) پر ختم ہوا تھا اور جس کے بعد کولکتے کے قلمی نسخے میں ڈیڑھ اوراق (تقریباً ڈھائی صفحات) خالی ہیں جن سے یہ واضح تاثر ملتا ہے کہ قلمی نسخہ یہاں اختتام پذیر ہوگیا تھا۔

سیر الاولیا کا ایک قلمی نسخہ NM.1963-261 کی درجہ بندی کے تحت کراچی کے قومی میوزیم میں ہے، جس پر نہ اس کا سنہ کتابت تحریر ہے، نہ کاتب کا نام درج ہے اور نہ ہی اوراق (یا صفحات) کے نمبر دیے گئے ہیں، صفحات گنیں تو ان کی کل تعداد ۶۷۲ بنتی ہے یعنی برٹش لائبریری لندن کے قلمی نسخے سے ۶۹ صفحات زیادہ، ان ۶۹ صفحات میں سے آخری تقریباً ۱۳ صفحات (یعنی مفروضہ صفحات ۶۶۰ تا ۶۷۲) کا متن ''نفس آں بادشاہ زادہ در کار رشد'' کے بعد کتابت کیا گیا ہے، اس قلمی نسخے میں ''بعد میں ہونے والا اضافہ'' ہے۔

کراچی میوزیم کے قلمی نسخے کا آغاز ان ہی فقروں سے ہوتا ہے جن سے چرنجی لال فارسی اڈیشن (لاہور ۱۹۷۸ء) اور برٹش لائبریری کے قلمی نسخے (۱۶۸۲ء) کا آغاز ہوتا ہے، تاہم کراچی میوزیم کے نسخے کے آخری صفحے یعنی مفروضہ صفحہ نمبر ۶۷۲ پر آخری فقرہ یہ ہے:

''بہ ضرورت بر تخت سلطنت جلوس فرمود و مردم از محنت و اندوہ آسودہ گردانید''۔

یاد رہے کہ چرنجی لال (لاہور اڈیشن ۱۹۷۸ء) میں مندرجہ بالا فقرے کے بعد ایک فقرہ اور بھی آتا ہے جو سلطان فیروز شاہ تغلق کی تاریخ وفات کے بارے میں ہے، یہ چرنجی لال اڈیشن میں ''اضافہ در اضافہ'' ہے۔

بحث کو سمیٹتے ہوئے ہم کہیں گے کہ سیر الاولیا کے لندن اور کراچی کے مخطوطوں اور چرنجی لال اڈیشن کا آغاز یکساں ہے (کولکتے کے قلمی نسخے کے ابتدائی فقروں سے تقابل یوں ممکن نہیں کہ اس کے بہت سے ابتدائی اوراق غائب ہیں)، تاہم اختتام یکساں نہیں، اختتامی فقروں کے تقابلی جائزے سے معلوم ہوتا ہے کہ سیر الاولیا کا مکمل اور کافی حد تک مصدقہ قلمی نسخہ اغلباً وہ ہے جو برٹش لائبریری لندن میں ہے اور ساڑھے چھ سو برس پہلے جب امیر خورد کرمانی نے بہت محنت اور محبت سے سیر الاولیا مرتب کی تو وہ اس فقرے پر ختم کی:

''نفس آں بادشاہ زادہ در کار رشد''۔

جیسا کہ پچھلے صفحات میں بتایا گیا ہے، سیر الاولیا کا یہ فقرہ ایک صاحب کشف بادشاہ کی اس حکایت کے اختتام پر ہے جو سیر الاولیا کے علاوہ ''فوائد الفواد'' میں بھی درج ہے، سیر الاولیا کے آخری باب کا عنوان ہے ''حضرت سلطان المشائخ کے بعض ملفوظات اور نوشتے''، اس باب کے اختتام کے لیے سلطان المشائخ کے اپنے مستند ملفوظات سے بہتر فطری اور منطقی اختتام اور کیا ہوسکتا تھا؟

اس کے بعد ساڑھے چھ سو برس کے دوران مختلف حضرات مختلف وجوہ کی بنا پر وقتاً فوقتاً سیر الاولیا کے صحیح قلمی نسخے میں کبھی چند الفاظ، کہیں چند جملوں اور کبھی چند صفحات کا اضافہ کرتے رہے اور یہ اضافے سب سے زیادہ اس قلمی نسخے میں کیے گئے، جسے سامنے رکھ کر ۱۸۸۵ء میں لالہ چرنجی لال نے سیر الاولیا کو پہلی بار طبع کرایا، یہ اضافے متن کے ابتدا میں بھی ہیں، درمیان میں بھی اور آخر میں بھی، ذکر چوں کہ طویل ہوجائے گا، اس لیے ہم صرف آخر میں کیے گئے اضافوں کا مختصر ساذکر کرتے ہیں:

کراچی کا قلمی نسخہ: ۶۷۲ (مفروضہ) صفحات پر مشتمل اس قلمی نسخے میں "نفس آں بادشاہ زادہ در کار شد" کے بعد تقریباً ۱۳ صفحات کا اضافہ کیا گیا ہے، ان اضافوں کے بعد کراچی میوزیم کے قلمی نسخے کا آخری فقرہ جو مفروضہ صفحہ ۶۷۲ پر درج ہے، یہ ہے:

"بہ ضرورت بر تخت سلطنت جلوس فرمود و مردم را از محنت و اندوہ آسودہ کردانید"۔

اکیسویں صدی عیسوی میں یہ معلوم کرنا مشکل ہے کہ تیرہ صفحات کا یہ اضافہ کس نے کیا؟ کب کیا؟ اور کیوں کیا؟

چرنجی لال اڈیشن: اب ہر نوع کے "اضافوں" سے بھرپور چرنجی لال (لاہور ۱۹۷۸ء) اڈیشن کو لیں، جو برصغیر پاک و ہند میں سب سے مقبول رہا ہے، اس کے آخر میں نہ صرف وہ تمام اضافے موجود ہیں جو کراچی کے قلمی نسخے کے آخری (تقریباً) تیرہ صفحات میں موجود ہیں، بلکہ "مزید اضافے" کے طور پر چرنجی لال اڈیشن میں مندرجہ ذیل فقرے بھی موجود ہیں:

"تاریخ وفات سلطان فیروز شاہ فوت فیروز است کہ ہفصد و ہشتاد ونہ است و مدت سلطنت اوسی، و ہفت سال بود، تم بعونہ ہو العلی العظیم"۔

اکیسویں صدی عیسوی میں یہ کھوج لگانا مشکل ہے کہ یہ "اضافہ در مزید اضافہ" کس نے کیا؟ کب کیا؟ اور کیوں کیا؟

کولکتے کا قلمی نسخہ: آخر میں کولکتے کے قلمی نسخے پر نظر ڈالتے ہیں، اس کے آخر میں "اضافہ در اضافہ" کے طور پر شجروں پر مشتمل ڈھائی صفحات کا مزید اضافہ کر دیا گیا ہے، یہ وہ واحد اضافہ ہے جس کے بارے میں ہمیں معلوم ہے کہ یہ کس نے کیا؟ کب کیا؟ اور کیوں کیا؟

اسی نوع کے اضافوں کی مثال فرید الدین مسعود گنج شکرؒ کے (غلط) سنہ ولادت اور سال وصال سے تعلق رکھتی ہے جسے خدا جانے کب، کیوں اور کس بزرگوار نے سیر الاولیا کے متن کا حصہ بنا کر یا حاشیے پر لکھ کر اس بارے میں علما، مورخین اور محققین کو ایسی غلط فہمی میں مبتلا کیا جو صدیوں جاری رہی اور اکیسویں صدی عیسوی میں دور ہوئی، جب تک اس نوع کے "بعد میں ہونے والے اضافوں" کا تجزیہ کر کے اور انہیں تاریخ کی کسوٹی پر پرکھ کر غلط ثابت نہ کر دیا جائے،

ایک عام قاری جو سیر الاولیا جیسی صدیوں پرانی کتابوں کو تقدس کا درجہ دیتا ہے، انہیں سیر الاولیا کا حصہ جان کر درست سمجھتا رہے گا۔

سیر الاولیا ہماری تاریخ کا ایک اہم ماخذ ہے، برصغیر پاک و ہند کے جید علما، مورخین اور محققین کو چاہیے کہ وہ انفرادی یا اجتماعی طور پر سیر الاولیا کے چند مستند مخطوطات سامنے رکھ کر انہیں ایڈٹ کر کے اور حسب ضرورت زیریں حاشیے دے کر (اور یہ ضرورت جگہ جگہ محسوس ہوگی) پہلے مرحلے میں سیر الاولیا کا ایک مصدقہ فارسی اڈیشن مرتب کریں، اگر یہ ممکن نہ ہو تو کوئی حکومتی ادارہ، اشاعتی ادارہ یا دردمند اور مخیر فرد کم از کم سیر الاولیا کے لندن کے مخطوطے کی شایانِ شان اشاعت کا اہتمام کرے جو سیر الاولیا کا اغلباً مکمل اور کافی حد تک مصدقہ مخطوطہ ہے۔

۱۸۸۵ء تک سیر الاولیا قلمی نسخوں تک محدود تھی، اس سال چرنجی لال نے اسے کتابی شکل میں پریس سے چھپوایا، لالہ چرنجی لال کی کوشش انیسویں صدی عیسوی میں سیر الاولیا کی اشاعت کے لیے بڑا قدم تھا، یہ کتاب فارسی زبان میں تھی، بیسویں صدی عیسوی میں برصغیر پاک و ہند کے کئی اشاعتی اداروں نے اس کے اردو تراجم چھاپے جو بیسویں صدی میں سیر الاولیا کی اشاعت کے لیے دوسرا بڑا قدم تھا، اکیسویں صدی عیسوی کے تقاضے مختلف ہیں۔

پہلی ضرورت یہ ہے کہ سیر الاولیا میں "بعد میں ہونے والے اضافے" امکانی حد تک حذف کر کے اور اس کی بدیہی اغلاط دور کر کے، اس کا ایک دیدہ زیب، مکمل اور مصدقہ فارسی اڈیشن شائع کیا جائے جس کے لیے بالائی سطور میں دو متبادل تجاویز دی گئی ہیں، دوسری ضرورت یہ ہے کہ اس کا ایک مجمل اور مصدقہ اردو ترجمہ شائع کیا جائے جو اکیسویں صدی کے قاری کی ضروریات اور توقعات دونوں کو پورا کر سکے اور انٹرنیٹ پر بھی دست یاب ہو۔

کیا اکیسویں صدی کا کوئی لالہ چرنجی لال ان کاموں کا بیڑا اٹھا سکے گا؟ ع

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے

اخبار علمیہ

"تقویم وقائع" کے نام سے سلطنت عثمانیہ کا گزیٹ اب سی ڈی اور ڈی وی ڈی پر دستیاب ہے، یہ ۱۸۳۱ء سے ۱۹۲۳ء تک کے حالات پر مشتمل ہے، یہ اہم اور وقیع کام ارسیکا (IRCICA) نے انجام دیا ہے، یکم نومبر ۱۸۳۱ء سے ۹/اپریل ۱۸۹۲ء تک ایک حصے میں ۱۸۸۰ وقائع ہیں، دوسرے میں ۲۶/مارچ ۱۸۹۱ء سے ۱۴/مئی ۱۸۹۲ء تک ۲۸۳ وقائع کا اندراج ہے، تیسرے یعنی ۲۸/ستمبر ۱۹۰۸ء سے ۴/نومبر ۱۹۲۲ء تک کے حصے میں ۲۰۰۸ وقائع آگئے ہیں، اس مجموعے سے فوجی، معاشی، صنعتی، سائنسی اور قانونی اطلاعات و توضیحات کے علاوہ عوامی درخواستوں کا علم بھی ہوتا ہے، اصلاً ترکی زبان میں شائع ہونے والے اس مجموعہ وقائع کے کچھ اجزا عربی، فارسی، آرمینیائی، یونانی اور فرانسیسی زبانوں میں بھی شائع ہوچکے ہیں، سلطنت عثمانیہ سے دل چسپی رکھنے والے محققین کے لیے اس کی افادیت ظاہر ہے، اب سی ڈی اور ڈی وی ڈی کے ذریعہ یہ محققین کے لیے اور سہل الحصول ہے اور اس کے لیے ارسیکا واقعی لائق تحسین ہے۔

انسانی سفیر کی حیثیت سے بھیجے جانے والے خلائی جہاز "فینکس" نے ۲۵/مئی ۲۰۰۸ء کو مریخ کے قطب شمالی پر قدم رکھا، اس نے خوردبین سے حاصل شدہ تصویروں میں کم و بیش ایک ہزار ذرات دکھائے ہیں، یہ ذرات انسانی بال کے دسویں حصہ سے بھی چھوٹے اور باریک ہیں، ان ذرات کے مطالعہ میں سائنس دانوں کو چار قسم کی معدنیات کا علم ہوا ہے، کالے رنگ کے چمک دار ذرات جو مریخ کے قدیم آتش فشانی پہاڑوں کے باریک ترین ذرات ہیں اور یہ زیادہ تر سرخی مائل ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں لوہے کی بہتات ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہ سیارہ نارنجی رنگ کا نظر آتا ہے، اس سفر کے تجربہ کی روشنی میں سائنس دانوں نے کہا ہے کہ مریخ پر میگنیشیم، سوڈیم، پوٹاشیم اور کلورائڈ سمیت مختلف قسم کے معدنی اجزا موجود ہیں، اس جہاز میں ایسی مٹی کا نمونہ بھی ہے جو ایک ہزار ڈگری سلسیس پر گرم ہوئی تھی، یوں تو سائنس داں مریخی مٹی

کے تمام اجزائے ترکیبی پر غور وخوض کررہے ہیں لیکن ان کی اصل توجہ کاربن، ہائیڈروجن، نائٹروجن، آکسیجن، گندھک اور فاسفورس پر مرکوز ہے کیوں کہ یہی عناصر زندگی کے اجزائے ضروریہ ہیں۔

تعلیم کے میدان میں آکسفورڈ یونی ورسٹی لندن کا امتیاز اور معیار مسلم ہے، اس نے "جدید ہندوستان" کے موضوع پر ایک نصاب اکتوبر میں پڑھانے کا منصوبہ بنالیا ہے، اس سے ہندوستان اور آکسفورڈ کے علمی روابط کو استحکام اور اس کو نئی جہتیں ملیں گی، اس کا مقصد طلبا کے لیے ہندوستان اور اس کے ترقی پذیر معاشی نظام کو سمجھنے کے مواقع فراہم کرنا ہے، طلبہ کے ابتدائی گروپ میں امریکا، کناڈا، انگلینڈ اور ہندوستان کے ۱۸ طلبہ ہوں گے، اس نصاب کے تحت چھ موضوعات بین الاقوامی سیاست اور باہمی تعلقات، ملکی سیاست، تہذیب، فروغ انسانی وسائل، ماحولیات اور اقتصادیات ہیں۔

سائنسی جریدہ "نیچر" کی ایک خبر کے مطابق اسپین کے سائنس دانوں نے دس لاکھ سال پرانے ایک انسانی جبڑے کو دریافت کیا ہے جو نچلے جبڑے کے سات دانتوں پر مشتمل ہے جب کہ ایک دانت الگ سے بھی ہے، پتھروں کے اوزار اور جانوروں کی ہڈیاں بھی وہیں پائی گئی ہیں، جبڑے کے چھوٹے سائز سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کسی عورت کا ہے، اسپین میں نظریہ ارتقا کے ایک تحقیقی ادارے کا خیال ہے کہ اسپین کے صوبہ برگوس کے علاقہ اٹاپیورکا میں اب تک یہ دریافت سب سے قدیم ہے، اس سے قبل ۱۹۹۴ میں اٹاپیورکا کے غاروں میں جو انسانی باقیات پائے گئے تھے وہ ۸ لاکھ برس پرانے تھے اور جسے "اولین انسان" کا نام دیا گیا تھا۔

امریکہ کے "نیوسائنٹسٹ" رسالہ میں کہا گیا ہے کہ کیلی فورنیا یونی ورسٹی آف ٹیکنالوجی کے محققین نے تین ایسے لوگوں کا پتہ لگایا ہے جو جس تصویر کو دیکھتے ہیں اس کو سن بھی سکتے ہیں، ان کے مطابق یہ ایک خاص طرح کی علامت ہے جسے "سنستھیزیا" کہتے ہیں اور اس میں انسان کے متعدد حواس ایک دوسرے میں مل جاتے ہیں اور انسان جو کچھ سنتا ہے اسے دیکھ بھی سکتا ہے، یہ بات اس وقت سامنے آئی جب ایک طالب علم نے یہ دعوا کیا کہ وہ کمپیوٹر کے اسکرین سیور میں سے کچھ آوازیں سن سکتا ہے، تحقیق سے پتہ چلا ہے کہ انسانوں میں ایک علامت یہ بھی پائی جاتی

ہے کہ وہ کچھ الفاظ اور نمبروں کو رنگ کے طور پر دیکھ بھی سکتا ہے۔

۱۹۸۵ء میں امریکا میں ناسا کے نام سے جو سائنسی تحقیقاتی ادارہ قائم کیا گیا اس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ فضا کی اندرونی و بیرونی پرواز کے متعلق بھی تحقیق ہو، اس مقصد میں بڑی حد تک کامیابی اور اس راہ میں ایجادوں کے سبب ادارے نے دنیا میں اعتبار قائم کرلیا ہے، اکتوبر ۲۰۰۸ء میں ادارے کی طلائی جوبلی کے موقع پر فضائی اور خلائی تحقیقات کی نمائش کا اہتمام کیا گیا ہے، یہ سائنس دانوں، طلبہ اور جامعات کے اساتذہ کے علاوہ آرٹ کے شیدائیوں کے لیے بھی ایک نہایت دل چسپ نمائش ہوگی۔

”ٹائمس آف انڈیا“ میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ مرکزی حکومت نے ۱۲ر مرکزی یونی ورسٹیوں کے قیام اور مدرسوں میں اعلا معیاری تعلیم کی ترقی کے لیے ایک اسکیم کا اعلان کیا ہے، یہ یونی ورسٹیاں بہار، جھارکھنڈ، اڑیسہ، گجرات، ہریانہ، پنجاب، راجستھان، ہماچل پردیش، جموں اینڈ کشمیر، کرناٹک، کیرالا اور تمل ناڈو میں قائم کی جائیں گی، نیز وہ مدرسے جنہوں نے اپنے نصاب میں سائنس، ریاضی، سماجی علوم، لسانیات اور انگریزی کو شامل کیا ہے، حکومت کی اسکیم کے تحت فائدے اٹھا سکتے ہیں، اس اسکیم کے لیے ۳۲۵ کروڑ روپے مرکزی حکومت نے مختص کیے ہیں۔

ایک خبر کے مطابق یورپ، امریکا اور جاپان کے سائنس داں زمین کے مدار پر قدرے کم بلندی پر بہت بڑے شمسی پینل نصب کرنے کا جائزہ لے رہے ہیں، اس منصوبہ کے روبہ عمل لانے کے بعد کارخانوں اور گھروں کے لیے کم قیمت شمسی توانائی حاصل کی جاسکے گی، زمین کی آب وہوا سے قدرے اوپر سولر پینل لگانے کا فائدہ یہ بھی ہوگا کہ سورج کی شعاعوں اور ان پینلوں کے درمیان بادل حائل نہیں ہوسکیں گے اور یوں شمسی توانائی کے مسلسل حصول کا امکان بڑھ جائے گا، یہ منصوبہ جس قدر اہم اور وقیع ہے، اتنا ہی اس کی تکمیل میں متعدد تکنیکی چیلنجوں کا سامنا بھی ہے۔

ک ص اصلاحی

معارف کی ڈاک

مکتوب گورکھ پور

محلہ نظام پور
ڈاک خانہ گیتا پریس
گورکھ پور-۲۷۳۰۰۵

مکرم محترم عمیر الصدیق صاحب

السلام علیکم

امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا، کہتے ہیں وقت دل کے زخموں کا مرہم ہوتا ہے لیکن مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب مرحوم کی ناگہانی موت کا جو زخم دل پر لگا ہے، ہنوز تازہ ہے، فی الحال وقت کا مرہم اس پر کارگر نہیں ہوا ہے، مرحوم میرے دیرینہ کرم فرما تھے، علی گڑھ جب بھی آتے غریب خانے پر پروفیسر ظفر الاسلام صاحب کے ساتھ وقت نکال کر ضرور ملنے آتے، میرے اصرار پر ایک وقت کا کھانا بھی ساتھ ہی کھاتے تھے، کئی قریبی عزیزوں اور رشتہ داروں کی ناگہانی موت کا ماتم گسار ہوں لیکن ضیاء الدین اصلاحی صاحب کی موت کا غم زیادہ شدید رہا، بہ قول اکبر

زخمی نہ ہوا تھا دل ایسا سینے میں کھٹک دن رات نہ تھی
پہلے بھی ہوئے تھے کچھ صدمے روئے تھے مگر یہ بات نہ تھی

بہرحال اب صرف مغفرت کی دعا ہی کی جاسکتی ہے جو کرتا رہتا ہوں۔

دریافت طلب امر یہ ہے کہ اگست ۲۰۰۸ء کے معارف کے شمارے میں مولانا سعید انصاری پر ڈاکٹر الیاس الاعظمی کا فاضلانہ مضمون شائع ہوا ہے، مطالعہ سے پتہ چلا کہ ان کی کوئی کتاب ”سیر الصحابیات“[1] ہے جو دار المصنفین سے شائع ہوئی تھی، معارف کے شماروں میں دار المصنفین سے شائع جن کتابوں کی فہرست دی جاتی ہے اس میں اس نام کی کوئی تصنیف شامل نہیں ہے، مجھے یہ کتاب چاہیے، کہاں سے ملے گی؟

میں معارف کا تاحیات رکن ہوں، معارف برابر آتا رہتا ہے، امید کہ پروفیسر اشتیاق احمد ظلی اور آپ کی ادارت میں معارف اپنا معیار برقرار رکھے گا اور دار المصنفین کو مزید ترقی اور شہرت حاصل ہوگی۔

نیاز مند　محمد معتصم عباسی

[1] فہرست مطبوعات دار المصنفین میں سلسلۂ سیر الصحابہ کے ذیل میں درج ہے۔　قیمت: ۴۵/= روپے

وفیات

جناب صلاح الدین اویسی مرحوم

جناب غلام محمود بنات والا کی فرقت کا صدمہ ابھی کم نہ ہوا تھا کہ مجلس اتحاد المسلمین کے قائد، فرزند دکن اور سالار ملت، سلطان صلاح الدین اویسی بھی اس دنیا سے رخصت ہوگئے، امت ایک اور ہوش مند، جرأت مند اور حوصلہ مند راہبر سے محروم ہوگئی، وہ عرصے سے صاحب فراش تھے، عمر مستعار کم نہ تھی، وقت موعود آیا اور رمضان المبارک کے نہایت مبارک اور آخری عشرے میں یعنی ۲۸ رمضان کو وہ اپنے مالک حقیقی کی رحمتوں سے جاملے، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

قریب ساٹھ ستر سال پہلے جب مجلس اتحاد المسلمین کے بانی نواب بہادر یار جنگ کا ۱۹۴۴ میں انتقال ہوا تھا تو اس وقت مولانا سید سلیمان ندوی نے معارف میں ان کا ماتم کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "ان کا سا آدمی صدیوں میں پیدا ہوتا ہے اور جب پیدا ہوتا ہے تو انقلاب انگیز ہوتا ہے، ان کی ذات سے امت اسلامیہ کو بڑی بڑی امیدیں قائم تھیں اور خصوصیت کے ساتھ دکن کے مسلمانوں کے حق میں ان کا وجود آب حیات کا حکم رکھتا تھا"۔

۱۹۴۴ اور ۲۰۰۸ کا زمانی فرق، تغیرات احوال کے لحاظ سے زمین آسمان کا فرق ہے لیکن صلاح الدین اویسی مرحوم کی ہستی کے لیے ان الفاظ کی حقیقت میں ذرا فرق نہیں۔

سلطنت آصفیہ اسلامیہ میں مجلس اتحاد المسلمین کا قیام، قومی تخیل اور سیاسی جذبوں کو نئی زندگی دینے کے ساتھ مسلمانوں کی تعلیمی اور معاشرتی ترقی کے لیے ہوا تھا، نصب العین تو "وسیع تر، عظیم تر، بیرونی واندرونی مداخلتوں سے پاک اور کامل آزاد حیدر آباد" تھا، اس وقت اس مجلس کے حوصلوں کو دیکھ کر کہا گیا تھا کہ دکن کے مسلمانوں نے صدیوں کے آرام کے بعد کروٹ لی ہے لیکن چند برسوں کے بعد تداول ایام کی ایک اور تفسیر سامنے آئی، نہ سلطنت رہی نہ آصفی شان وشوکت، مسلم کی روایتی سادگی اور اوروں کی عیاری نے ساری بساط ہی پلٹ دی، سلطنت آصفیہ کی تباہی، زوال بغداد اور خلافت اسلامیہ کے سقوط سے کم تکلیف دہ نہیں تھی، احساس شکست وریخت نے

قدرتاً سب سے زیادہ وہاں کے مسلمانوں کو ناتواں اور حیران وسرگرداں کیا، مجلس بھی درہم برہم ہوئی، اس کے قائدین یا تو زندانی ہوئے یا پاکستانی، ایسے میں پاک نفس مولوی عبدالواحد اویسی ایڈوکیٹ نے جماعت کی جمعیت خاطر کی ہمت کی، شیرازہ بندی کی اس کوشش میں وہ پابند سلاسل ہوئے لیکن مجلس نے اپنے کردار کا احساس دلانا شروع کردیا، ۶۲ میں عبدالواحد اویسی کے صاحب زادے صلاح الدین اویسی ریاستی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور ۷۵ء میں والد کے انتقال کے بعد مجلس کی باگ ڈور بھی ان کے ہاتھوں میں آگئی، اس کے بعد حیدر آباد کی تاریخ گویا مجلس کی تاریخ بلکہ گرداب بلا کی داستان ہے، قلی قطب شاہ کے محبوب شہر کو ظالموں نے قرطبہ وغرناطہ کی طرح تاریخ زوال کے صفحات میں گم کردینا چاہا لیکن یہ اویسی مرحوم کی ہوش مند قیادت تھی جس نے فرخندہ بنیاد حیدر آباد کو برباد نہ ہونے دیا اور ارض دکن میں ہمت، حوصلہ اور اجتماعیت کی قابل تقلید مثال پیش کردی، حیدر آباد ہی کے شاعر کے دل پر خدا جانے کیا گزری کہ اس نے اپنے چارہ گر سے پوچھ لیا کہ اس کی زنبیل میں نسخہ کیمیائے محبت اور علاج ومداوائے الفت بھی ہے، چارہ گر نے مخدوم کے سوال کا جواب سلطان کی شکل میں پیش کردیا، اویسی مرحوم متعدد بار اور شاید مسلسل پارلیمنٹ کے رکن منتخب ہوتے رہے، یہ ان کی انتظامی صلاحیت سے زیادہ ان کے کاموں کی مقبولیت اور ان پر جمہور کے اعتماد کا مظہر ہے، حیدر آباد میں فکری ومسلکی اختلافات کے باوجود، یہ ان کی حکمت وبصیرت تھی جس نے اختلاف کو افتراق میں نہیں بدلنے دیا، وہ جسمانی لحاظ سے قدآور تھے اور سیاسی فہم وبصیرت میں بھی وہ بلند قامت رہے، حیدر آباد کا دارالسلام ہو یا دلی کا دارالعوام، کلمۂ حق کے بے باکانہ اور مدلل اور منطقیانہ اظہار کے لیے ان کی تقریریں اور باتیں اپنوں کے علاوہ غیروں نے بھی قدر واحترام سے سنیں، حیدر آباد کے لیے وہ خاص تھے لیکن ملت کے ملکی مسائل میں وہ مسلم پرسنل لا بورڈ اور دوسری کل ہند تنظیموں کے ساتھ بھی تھے اور درحقیقت ان کی ضرورت ملکی پیمانے ہی کی تھی لیکن حیدر آباد کی تعلیمی ومعاشی منصوبہ سازیوں کے ذریعہ شاید وہ دوسرے علاقوں کی مسلم قیادت کو میدان عمل میں آنے کی تلقین پر زیادہ یقین رکھتے تھے، موجودہ انتہائی جاں گسل حالات میں ان کے نہ ہونے سے محرومی کا احساس اور سوا ہو گیا ہے لیکن انہوں نے مجلس کی قیادت کے لیے لائق جماعت تیار کردی جس سے توقع ہے کہ وہ اتحاد کی اسی روش پر قائم رہے گی،

جس کے لیے بہادر یار جنگ سے اویسی مرحوم کوشاں رہے، نصف صدی کی محنت اور اس کے ثمر کو باقی رکھنا بجائے خود بڑا دشوار مرحلہ ہے، ہماری زمین کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ قیامت کی نفاق وافتراق انگیز ہے، قیادت کی ذراسی غفلت سے یہ نفاق برگ وبار لاسکتا ہے اور اب امت شاید اس کی متحمل نہ ہو سکے، اویسی مرحوم کا جنازہ جس شان سے اٹھا وہ عندالناس ان کی مقبولیت کی علامت ہے، اصل قبول تو اللہ کے نزدیک ہے جس کا ایک اشارہ رمضان کے مبارک مہینے کی مبارک ترین ساعتوں میں ان کا اپنے رب سے جاملنا ہے، فبشرہ بمغفرۃ واجر کریم۔

جناب الحاج منظور علی لکھنوی مرحوم

دارالمصنفین میں الحاج منظور علی لکھنوی کی رحلت کی خبر بڑے افسوس کے ساتھ سنی گئی، ۲۸؍رمضان المبارک کو وہ اپنے خالق حقیقی کے جوار رحمت میں پہنچ گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

وہ زندگی میں پاکیزہ اطوار رہے، آخری وقت بھی اس پاکیزگی کی شہادت کے لیے قدرت نے مقرر کردیا، وہ سیاسی رہنما تھے اور نہ عالم وفاضل لیکن ان کی زندگی قطرے سے گہر ہونے کی کہانی ہے، کلکتہ کے ہوٹل بزنس سے تعلق تھا، ان کا رائل انڈین ہوٹل کلکتہ کے مشہور ترین ہوٹلوں میں ہے، تمول کی آغوش میں آنکھیں کھولیں، عام امیر زادوں کا رنگ ڈھنگ ہونا قدرتی تھا، ایک وقت تھا کہ قیمتی پتھروں اور بیش قیمت خوشبوؤں کو جمع کرنے کا شوق تھا لیکن فطرت کی سلامتی اور سرشت کی پاک طینتی نے ایک دن ان کی زندگی کا رخ بدل دیا، ثروت کو اللہ کی دی ہوئی نعمت سمجھنے اور برتنے کی توفیق، باندازۂ ہمت ملی اور زندگی قابل رشک ہوگئی، دارالعلوم ندوۃ العلما کی مجلس انتظامیہ، مسلم پرسنل لابورڈ، ملی کونسل، امارت شرعیہ جیسے باوقار اداروں کی رکنیت اور سب سے بڑھ کر حجاج کرام کی پیہم خدمت نے ان کو اپنے طبقہ میں امتیاز کا شرف بخشا اور اس سے زیادہ کلکتہ میں ان کی وہ رفاہی خدمات ہیں جن کا علم بہ جز اللہ اور ان کے انتہائی قریبی لوگوں کے اور کسی کو نہیں معلوم، کمال کے شخص تھے، مولانا عبدالماجد دریابادی کو کبھی نہیں دیکھا لیکن ان کی تحریروں کے ایسے شیدائی ہوئے کہ ان کی کتابوں کی خوب صورت ترین اور نہایت دیدہ زیب طباعت و اشاعت کے لیے بغیر کسی تاجرانہ فائدے کے، اپنے مال کا بے دریغ استعمال کیا، ادارہ انشائے ماجد

اسی نیت سے قائم کیا جس نے خطبات ماجد سے مکتوبات ماجدی تک مولانا کی دسیوں کتابیں بڑے اہتمام سے شائع کیں، مولانا دریابادی کی آرزو خود ان کی زبانی سننے میں آتی تھی کہ کاش ان کی کتابیں بھی مولانا علی میاں اور مولانا مودودی کی کتابوں کی طرح خوب صورت طباعت سے آراستہ ہوں، ان کی یہ تمنا ان کے نادیدہ مخلص نے جس طرح پوری کی وہ ادب ماجدی کے پرستاروں کے لیے مخفی نہیں، دارالمصنفین کے وہ خود لائف ممبر تھے اور ان کی مساعی سے کلکتہ کے متعدد قدردان علم بھی لائف ممبر ہوئے، وہ کلکتہ میں ایک عرصے سے دارالمصنفین والوں کے میزبان تھے، سید صباح الدین عبدالرحمان مرحوم نے کئی بار شذرات میں ان کی غیر معمولی ضیافت کے ساتھ ان کی بھلمنساہت، تواضع، شیریں کلامی اور مہمان نوازی کی خوبیوں کا ذکر کیا، مولانا ضیاء الدین اصلاحی مرحوم نے بھی ہمیشہ ان کی ان صفات کا اظہار اپنے شذرات میں کیا، کلکتہ میں ان کے شاندار مکان کی سب سے شاندار خوبی ان کا کتب خانہ تھا، ادب عالیہ پر مشتمل ان کا یہ ذخیرۂ کتب صرف حسن انتخاب ہی نہیں، بہترین نگہداشت کا نمونہ ہے، بہ قول سید صباح الدین عبدالرحمان جیسے کتابوں کا لالہ زار اور مینا بازار سجا ہو، وہ میرے والد ماجد مرحوم کے محبوں اور مخلصوں میں تھے، والد مرحوم کے انتقال کے بعد انہوں نے ہم کو باپ جیسی شفقت دی، اس کی داستان بڑی دراز ہے، عبادت وللہیت میں وہ جس مقام پر فائز تھے، اس کی تربیت میں کلکتہ کے مشہور عالم، مفسر اور حکیم جناب مولانا محمد زماں حسینی کی نگاہ کا فیض بھی شامل تھا، علم اور دین کی طلب اور تڑپ کا اندازہ اس وقت ہوتا جب وہ قاسمی دواخانے میں حکیم صاحبؒ کی مجلس میں نیازمندانہ حاضر ہوتے، یہی تعلق بعد میں حکیم صاحب کے لائق و نامور فرزند حکیم عرفان الحسینی سے بھی قائم رہا، ایسے علم نواز، وضع دار اور امت کے درد کو اپنے سینے میں سموئے انسان کا رخصت ہونا واقعی اسلامی معاشرے کا بڑا خلا اور خسارہ ہے، ان کے پس ماندگان میں ان کے صاحب زادوں کے علاوہ ان کے بھائی جناب مقصود علی لکھنوی ہیں اور وہ بھی سخت علیل ہیں، ان کی صحت اور تمام پس ماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا ہے اور مرحوم کے لیے بھی کہ اللہ تعالیٰ ان کے حسنات کو قبول فرما کر فردوس بریں میں ان کو اپنا قرب عطا کرے، آمین۔

ع۔ص

ادبیات

نعت نبی ﷺ

جناب ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی

اللہ اللہ چسان طالعِ یاور دارم
بہ دلِ غم زدہ ام، حبِ پیمبرؐ دارم

جلوہ فرماست بہ کاشانۂ جان یادِ رسولؐ
محفلِ زیست بدین شمع، منور دارم

ای خوشا بخت، کز ان روز کہ چشم واشد
رغبتِ دیدن آن گنبدِ اخضر دارم

روز گارم چہ فریبد، کہ بہ پیشِ چشم
اثر پای غلامانِ پیمبرؐ دارم

دولتِ حبِ خدا، حبِ نبیؐ مالِ من است
زور دارم بہ کفِ خویش نہ من زر دارم

باد آرد سوی من کاش غبارِ طیبہ
سرمۂ چشم خودش سازم و بر سر دارم

روزِ محشر، چو زحدی گذرد تشنہ لبی
لب خویشم بہ لبِ موجۂ کوثر دارم

خاکِ نعلینِ نبیؐ روبم و در خلد رئیس
سرِ خود را زمہ و مہر فراتر دارم

سعادتِ ابدی، مالِ پیروانِ نبیؐ است
مکن بہ گفتۂ من شک کہ کار بولہبی است

غلامیِ شہِ ابرار، افتخارم بس!
چہ تخت وتاج، چہ طاقت، چہ نسبتِ نسبی است

نسب چہ فخر فزاید کہ ذاتِ پاکِ رسولؐ
متاعِ فخرِ ہمہ ہاشمی و مطلبی است

اطاعتِ شہِ طیبہ براتِ رحمتِ حق
کہ دین چیست؟ ہمانا کہ پیرویِ نبیؐ است

چسان فریبِ ھوای بتانِ ہند خورم
مشامِ جاں چو معطر ز نکہتِ عربی است

پوسٹ بکس نمبر ۱۱۴، علی گڑھ، ۲۰۲۰۰۲۔

مطبوعات جدیدہ

مکی عہد نبوی میں اسلامی احکام کا ارتقاء: از جناب مولانا پروفیسر محمد یاسین مظہر صدیقی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد، صفحات ۶۰۰، قیمت: ۳۰۰ روپے، پتہ: قرآن اکیڈمی، صفا شریعت کالج، ڈومریا گنج ضلع سدھارتھ نگر، یوپی اور فرید بک ڈپو، ۲۱۵۸، ایم پی اسٹریٹ، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی-۲۔

عہد رسالت مآب مکہ اور مدینہ میں منقسم ہے، اس مکانی تقسیم کو عموماً اور کسی حد تک قدرتاً سیرت طیبہ کی زمانی تقسیم پر بھی منطبق کیا جاتا ہے، تاریخی لحاظ سے یہ جائز بھی ہے اور ناگزیر بھی اور اگر سیرت وشخصیت پر اس تقسیم زمان ومکان کے اثرات کی نشان دہی کی جائے تو یہ سیرت نگار کی یا تاریخ اسلام کے مورخ کی بے بصیرتی نہیں ہے، اس کتاب کے فاضل اور مشہور مصنف کے خیال میں یہ تقسیم بے معنی ہے اور اس دعوی کے اثبات میں ان کا یہ خیال ان کے لیے دلیل ہے کہ مکہ اور مدینہ دونوں جگہ اور دونوں دور میں اسلامی دین وشریعت اپنے اصول ومبادی میں یکساں ہے، اگر کچھ فرق ہے تو یہ صرف ارتقاء کے عمل کا ہے، ان کو یہ احساس شدت سے ہے کہ مکی و مدنی اسلام کی بہ ظاہر تفریق تو نہیں کی گئی لیکن عملاً یہ ضرور کی گئی، انہوں نے اس کو بے خبری پر محمول کیا ہے اور اپنے متعارف تحقیقی مزاج وشان کے مطابق اس ضخیم کتاب میں اس خیال کو رد کرنے کی کوشش کی ہے کہ احکام اسلامی تو مقامات مدنی ہیں اور ارکان خمسہ میں سے صرف توحید، ایمان اور نماز مکی ہیں، ان کے نزدیک بعثت نبوی سے پہلے کے زمانے کو جاہلیت یا قبل اسلام کا زمانہ اور بعثت کے بعد اسلام کا زمانہ کہنا درست نہیں، جس کی وجہ سے نبی کریم کی رسالت ونبوت کے بعد کا دور صرف اسلام کہا گیا اور اگلے تمام انبیا ورسل کے دین کو اسلام سے الگ دوسرا مذہب بتایا گیا، اس نظریے کو انہوں نے غیروں اور دشمنوں کا نظریہ قرار دیا کہ اس طرح انہوں نے اپنے دینی تجاوزات وانحرافات کے لیے ایک دینی سند فراہم کرلی، یہ خیال بہتوں کے لیے ناقابل فہم

ہوسکتا ہے، تاہم فاضل مصنف نے، طہارت، نماز، زکوۃ وصدقات، روزہ، حج، نکاح وطلاق، ولادت ورضاعت، وفات وجنازہ، کھانا پینا، تجارت، معیشت، معاشرت، حدود وتعزیرات وغیرہ عنوانوں سے مطالعہ اور محنت وتحقیق سے ایک ایسی بحث کا وافر مواد فراہم کردیا جو بہ حیثیت موضوع اور مضمون دونوں طرح منفرد ہے، مثلاً روزے کی بحث میں انہوں نے ثابت کیا کہ رمضان مبارک میں خاص جوار واعتکاف در مسجد حرام کی روایت جاہلی عربوں میں دین حنفی کی روایت تھی، مسجد حرام میں اعتکاف کی روایت مکی اسلام میں بھی جاری تھی، حالاں کہ حکم صیام کی آیت مدنی ہے، قریب ہر عنوان میں انہوں نے حضرت آدم اور دیگر انبیائے کرام سے اسلامی روایات کے تسلسل کو ثابت کرنا چاہا ہے، اس کوشش میں ضمناً یہ بھی فائدہ ہوا کہ ان موضوعات پر سیر حاصل بحث بھی آگئی ہے، اصل موضوع کے علاوہ یہ معلومات خود ایک نفع زائد ہیں، ضخامت کے باوجود کتابت کی صحت کا خیال رکھا گیا ہے لیکن شروع میں ''فکری ابوالعجمی'' سے شبہ ہوتا ہے کہ یہ ''بوالعجبی'' تو نہیں۔

۱- DR. IQBAL: THE HUMANIST

از پروفیسر ایس، جی عباس

۲- THE FLAME OF SINAI, HOPE AND VISION IN IQBAL

از ڈاکٹر شیلا میک ڈولف

۳- IQBAL, THE GREAT POET PHILOSOPHER OF THE MUSLIM WORLD

از جناب مجیب الرحمان۔

۴- IQBAL, EXISTENTIALISM AND OTHER ARTICLES

از پروفیسر نیاز عرفان۔

۵- THE EPISTEMOLOGY OF IQBAL

از ڈاکٹر خورشید انور۔

اقبالیات کے ذخیرے میں اردو کے علاوہ انگریزی اور دوسری زبانوں میں عمدہ کتابوں کی اشاعت کے لیے پاکستان کی اقبال اکادمی مسلسل مصروف عمل ہے، معارف کے سامنے مندرجہ بالا کتابوں کے علاوہ اکادمی کی اور بھی کتابیں ہیں، کتابوں کی کثرت اور مطبوعات جدیدہ کے صفحات کے انحصار کی وجہ سے وقت پر ان کتابوں کا تعارف اور ان پر تبصرہ نہیں آپاتا جس کے لیے ہم کو شرمندگی بھی ہوتی ہے، ان کتابوں پر کما حقہ تبصرہ کے لیے بڑا وقت چاہیے اور شاید مستقبل میں اس کی کوشش بھی کی جائے، تاہم سردست ہم صرف کچھ کتابوں اور ان کے مصنفین کے ناموں پر ہی اکتفا کرتے ہیں کہ باذوق قارئین کتابوں کے نام سے ہی ان کی اہمیت کا اندازہ کرسکتے ہیں، تحقیقی اور تصنیفی معیار کے لیے اقبال اکادمی کا نام کافی ہے اور موضوع جب اقبالیات ہو تو مطالعہ کی خواہش کا ہونا فطری بات ہے۔

مولانا کاتبی نیشاپوری: از جناب مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، صفحات ۸۸، قیمت: ۵۰ روپے، پتہ: ۸- پہلا فلور، ہندوستان بلڈنگ IT-P 2/10 اسٹریٹ، ممبئی نمبر ۴۔

مولانا عبدالسلام ندوی کی تصانیف کی قدر و قیمت کے بارے میں کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھانا ہے، کتابوں کے علاوہ ان کے مضامین بھی کثرت سے ہیں اور بعض بعض تو بجائے خود تالیف کا درجہ رکھتے ہیں، زیر نظر رسالہ یا کتاب ان کے ایک ایسے ہی مضمون کی دریافت ہے، کاتبی نیشاپوری نویں صدی ہجری میں سلطان شاہ رخ کے دور حکومت کے ارباب کمال میں ہیں، شعرالعجم میں ان کا ذکر کی وجہ سے رہ گیا، ان کے بعض نثری رسالوں کا ذکر تو ملتا ہے لیکن وہ اب دست یاب نہیں لیکن ان کا اصل سرمایہ امتیاز ان کی شاعری ہے، مثنوی، رباعی، قصیدہ اور غزل ان کی شاعری کا میدان ہے، شگفتگی، سرمستی اور جوش بیان نے ان کے صوفیانہ اور اخلاقی کو عجب تاثیر بخشی، قریب ستر برس پہلے ایک صاحب سید وزارت علی نے کاتبی کے کلام کا ایک انتخاب شائع کیا اور اس کے لیے مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم نے تعارفی تحریر سپرد قلم کی اور شان سے کی کہ حالات اور شاعری پر سیر حاصل بحث آگئی، زیر نظر رسالہ مولانا مرحوم کی یاد میں قائم مولانا عبدالسلام فاؤنڈیشن کی جانب سے گویا قند مکرر ہے اس کے لطف و لذت میں اضافہ پروفیسر کبیر احمد جائسی کے مبسوط مقدمے سے ہوا، جس میں یہ اعتراف

ہے کہ مولانا مرحوم نے کاتبی کی حیات کا جو جلوہ دکھایا ہے اس پر مشکل سے ہی اب کوئی اضافہ ہو سکے گا لیکن خود ان کے مقدمے نے کئی وقیع اور مفید معلومات سے اس جلوہ کی تابانیوں میں اضافہ کیا ہے، مولانا مرحوم کی تحریروں اور فارسی ادب کے شیدائیوں کے لیے یہ واقعی بہترین سوغات ہے۔

قاضی اطہر مبارک پوری کے سفرنامے: مرتب جناب مولانا ضیاء الحق خیر آبادی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات ۳۴۸، قیمت: ۱۴۰ روپے، پتہ: قاضی اطہر اکیڈمی، ۱۷۳/۳۵، ندوہ بلڈنگ، بی این ورما روڈ، امین آباد لکھنؤ۔

عالم، محقق، مورخ، صحافی، شاعر کی حیثیت سے قاضی اطہر مبارک پوری محتاج شناخت نہیں، وہ نام و نمود سے بے نیاز رہے لیکن خود شہرت اور ناموری ان سے بے گانہ نہ رہ سکی، ان کی پذیرائی ان کی زندگی میں علم و تحقیق کی دنیا میں شان سے ہوئی، اسی کا ایک اثر یہ بھی تھا کہ ملک اور بیرون ملک ان کے محبین و مخلصین کی خواہش ہوتی تھی کہ قاضی صاحب کی گذرگاہ ہونے کی سعادت ان کی بستیاں بھی حاصل کریں، قاضی صاحب بنیادی طور سے مورخ تھے اور سیروا فی الارض کے حکم کی حکمت کے واقف اسرار بھی تھے، اسی لیے انہوں نے جب کسی شہر کی سیاحت کی تو زائر و سیاح سے بلند ہو کر انہوں نے اپنے تاریخی شعور کو نگاہیں دیں اور جب انہوں نے اپنی سیاحت کے تاثرات قلم بند کیے تو ایسا معلوم ہوا کہ وہ اپنے قارئین کو بھی اس سیر میں برابر کا شریک کرنا چاہتے ہیں، لائق مرتب نے اچھا کیا کہ ان سفرناموں کو یکجا کیا اور زیر نظر کتاب کی شکل میں قارئین کے سامنے ایک دل چسپ، مفید اور پراز معلومات کا تحفہ پیش کر دیا، سفر حجاز و افریقہ کے علاوہ اس میں بھوپال، ایلورا اجنتا، اورنگ آباد، ناندیڑ، جون پور، برہان پور، غازی پور، کوکن، بھٹکل، میسور، بنگلور کے سفرنامے آگئے ہیں اور اس طرح کہ یہ ان علاقوں کی تاریخی و تمدنی معلومات کا بہترین مصدر بھی بن گئے ہیں، قاضی صاحب کی سادہ و برجستہ، حق گو اور مرعوب نہ ہونے والی شخصیت کا عکس سطر سطر سے نمایاں ہے اور اس پر مستزاد ان کا سادہ و بے عیب اور نہایت دل کش نثری اسلوب ہے۔

شاہ معین الدین احمد ندوی، حیات و خدمات: از ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات ۱۹۰، قیمت: ۱۰۰ روپے، پتہ: ادبی دائرہ، عقب آواس وکاس کالونی، رحمت نگر، اعظم گڈھ اور دوسرے معروف مکتبے۔

شاہ معین الدین احمد ندوی سابق ناظم دار المصنفین اور مدیر معارف، مولانا سید سلیمان ندوی کے تربیت اور فیض یافتہ تھے، سید صاحب کے بعد انہوں نے معارف کے علمی وقار کو جس شان سے قائم رکھا اور خود دار المصنفین کی ترقی اور نیک نامی میں جس قدر سعی بلیغ کی، اس کا اعتراف اہل قدر و نظر نے ان کی زندگی میں بھی کیا اور بعد میں بھی، زبانوں پر ان کی جلالت قدر کا اقرار رہا، یہ حق ہے کہ ان کا اسلوب زبان و بیان کے ان تمام محاسن کا امین ہے جو ان کے جلیل القدر استاد و مربی کا طرۂ امتیاز تھے، تاہم افسوس ہے کہ شاہ صاحب مرحوم پر تعمیر حیات کے ایک خاص نمبر، سید صباح الدین عبد الرحمان مرحوم کے ایک ناتکمل سلسلہ مضامین اور دو مختصر کتابوں کے علاوہ اور کچھ موجود نہیں، اسی احساس کے پیش نظر لائق مصنف نے ان کے حالات و سوانح اور علمی کارناموں کو از سر نو زیادہ تفصیل اور زیادہ سلیقے سے پیش کرنے کی کوشش کی اور ان کے حالات اور تصنیفات اور پھر ان کی روشنی میں ان کی ادبی، تنقیدی، تاریخی اور سوانحی تحریروں کا تجزیہ بھی کیا، آخر میں بعض مشاہیر کے نام شاہ صاحب کے خطوط کو بھی یکجا کیا گیا ہے، لائق مصنف کا مطالعہ وسیع ہے اور ان کو اخذ و انتخاب اور ترتیب و تقدیم کا بھی عمدہ سلیقہ ہے، کتاب کی ایک اور خوبی ڈاکٹر نعیم صدیقی ندوی، ڈاکٹر خلیق انجم اور پروفیسر خورشید ردولوی کی پر اثر تحریریں ہیں، ان تمام حضرات کا براہ راست تعلق شاہ صاحب سے تھا، اس لیے شاہ صاحب کی معرفت میں یہ تحریریں گویا سند کا درجہ رکھتی ہیں۔

ادبی اشارے: از جناب طیب عثمانی ندوی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت صفحات ۱۴۴، قیمت: ۷۵ روپے، پتہ: مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز D-307 ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی نمبر ۲۵۔

اس کتاب کے فاضل مصنف کا شمار ان مظلوم ادیبوں میں کیا جا سکتا ہے جن کی ادیبانہ اور نقادانہ صلاحیت کی بلند پائیگی کے باوجود اردو ادب و تنقید میں، گروہ بندیوں کی وجہ سے شایان شان مقام نہیں دیا گیا، ادب و مذہب کی یکجائی، رائج الوقت رویوں کے لیے خدا جانے کیوں برداشت کے قابل نہیں ٹھہری، کائنات، انسان، زندگی، خدا، نبوت، آخرت، اسلوب، ہیئت، جمالیات، تہذیب، تنقید، اقدار جیسے موضوعات سے ادب کے تعلق پر فکر انگیز اور دل کش پیرائے میں مضامین کا یہ مجموعہ ہمارے سوال کی اہمیت کو اور بڑھا دیتا ہے، قریب پچاس برسوں پر محیط یہ تحریریں فاضل مصنف کی

فکری وذہنی استقامت کی دلیل ہیں، ان کی ذہنی وادبی وابستگی دبستان شبلی سے ہے اور اس کا اثر ہر تحریر سے نمایاں ہے، پاکیزہ، ارفع اور مقصدی اور افادی ادب کی ضرورت ہر دور میں رہی ہے لیکن اب شناخت سے زیادہ قبولیت کا دور ہے اور اس میں اس چھوٹی سی کتاب کا کردار بہت بڑا ہوسکتا ہے۔

آئینہ شمس: از جناب محمد شمس الہدیٰ قیسی الفاروقی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد، صفحات ۱۹۲، قیمت: ۱۵۰ روپے، پتہ: الشمس، اسٹریٹ نمبر-۱، دھورا روڈ، علی گڑھ۔

عظیم تر اعظم گڈھ (یعنی جس میں موجودہ مئو اور غازی پور اور جون پور کی بعض بستیاں شامل ہیں) کے بعض خاندان ایسے ہیں جن میں نسل در نسل علم، شرافت اور عزت کی خوبیاں منتقل ہوتی آئی ہیں، ان میں ایک خاندان فاروقی ہے جس کے بیشتر افراد دینی وعصری تعلیم کی وجہ سے دینی ودنیوی اعلا مناصب پر فائز رہے اور ان میں علم وادب کی خدمت قدر مشترک رہی، زیر نظر شعری مجموعہ اسی خاندان فاروقی کے ایک ممتاز فرد جناب قیسی کے کلام پر مشتمل ہے، کتاب کھلی تو سب سے پہلے نعت کے تین اشعار پر نظر گئی، صرف ایک شعر سے کلام اور تخیل کی پاکیزگی اور بلندی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

شاید کہ ہوں در پردہ الفاظ و معانی بھی
اک نعت یہ حاضر ہے اشکوں کی زباں بھی

یہ نعت شریف کا شعر تھا، غزل کا یہ رکھ رکھاؤ ملاحظہ ہو

وفا ہماری بالآخر بروئے کار آئی
ہمارے نام پہ پہلی سی برہمی نہ رہی

اصل یہ ہے کہ شعر ویسا ہی ہوتا ہے جیسا صاحب شعر ہوتا ہے، جگر مرحوم کا یہ قول نقل کرکے مرتب نے اچھا کیا کہ شاعر کو پہلے شریف النفس ہونا چاہیے اور پھر سریع الفکر، جگر کو یہ نکتہ شاید اصغر سے ملا، یہ فیضان عام بھی ہوا ہوگا لیکن عارف عباسی اور قیسی فاروقی ان پاکیزہ گو شعرا میں ضرور ہیں جن کا کلام جگر کے قول کا عکاس ہے، مجموعہ یقیناً سامان نشاط روح اور شمس مرحوم کی تاب وتوانائی کا آئینہ ہے، دیباچہ شمس الرحمان فاروقی کے قلم سے ہے اور پیش لفظ قیسی مرحوم کے صاحب زادے نجم الاسلام فاروقی کا ہے، جنہوں نے اس خوب صورت مجموعہ کی اشاعت کا اہتمام کرکے اپنے والد مرحوم کی خدمت کی ایک بڑی سعادت حاصل کرلی۔

ع-ص